Phone 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

# طلوعِ اسلام

اکتوبر 1967

## سچّے موتی

### تھیا کریسی شرک ہے

روایت ہے کہ جب قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۹/۳۱)

یہود اور نصاریٰ نے اپنے علماء اور مشائخ کو خدا بنا لیا تھا۔ تو عدی بن حاتم نے کہا کہ وہ لوگ ان کی پرستش تو نہیں کرتے۔ پھر انہوں نے انہیں خدا کیسے بنا لیا تھا؟ اس پر رسول اللہ ؐ نے فرمایا کہ کیا یہ واقعہ نہیں کہ جس چیز کو ان کے علماء و مشائخ حلال قرار دیدیتے تھے یہ لوگ اسے حلال سمجھ لیتے تھے اور جسے وہ حرام قرار دیدیتے تھے اسے حرام۔ یہی علماء اور مشائخ کو خدا بنا لینا ہے۔

(ترمذی بحوالہ ابن کثیر)

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ : ایک روپیہ

Regd. L. No. 7243

MONTHLY TOLU-E-ISLAM LAHORE

ادارۂ طلوعِ اسلام کی حیات افروز پیش کش

# جہاد

پرویز

جہاد کیا ہے ــــــــ ؟
جہاد اور جنگ میں کیا فرق ہے ؟
مومن اور مجاہد کس طرح مرادف الفاظ ہیں ــــــ قرآن کی رو سے قوانین جنگ کیا ہیں ــــــ اسلامی لڑائیوں کے متعلق معترضین کے اعتراضات اور ان کے مدلل جواب۔
ایک مختصر لیکن جامع تصنیف۔
بصیرت افروز۔ حیات آموز۔
قیمت صرف ــــــ دو روپے فی جلد

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵/بی۔ گلبرگ لاہور

# معمارِ اوّل
## پاکستان کا

سرسیّد کی صحیح عظمت اور ہماری سیاسی زندگی میں اس کا مقام بلند ابھی تک ہمارے سامنے نہیں آیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر سرسید نہ ہوتا تو پاکستان بھی وجود میں نہ آتا۔ اس مختصر لیکن نہایت جامع کتاب میں سرسیّد کا صحیح مقام نہایت دلکش انداز میں سامنے لایا گیا ہے۔ بڑی پُراز معلومات کتاب ہے۔ قیمت صرف۔ تین روپے

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

# ماہنامہ طلوعِ اسلام (لاہور)


| ٹیلیفون | قیمت فی پرچہ | بدل اشتراک |
| --- | --- | --- |
| ۸۰۸۰۰ | پاکستان ۔ ایک روپیہ | سالانہ پاکستان دس روپے |
| خط و کتابت | ہندوستان ۔ ڈیڑھ روپیہ | سالانہ ہندوستان پندرہ روپے |
| ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/ بی ۔ گلبرگ ۲ ۔ لاہور | | سالانہ غیر ممالک ایک پونڈ |

جلد (۲۰) — اکتوبر (۱۹۶۷ء) — نمبر (۱۰)


## فہرست


۱۔ لمعات ۔۔۔۔۔۔ ۲
۲۔ شفق رنگ یادوں کے چراغ ۔۔۔۔۔۔ (پرویز صاحب) ۔۔۔۔۔۔ ۹
۳۔ عنقریب شائع ہونے والی کتابیں ۔۔۔۔۔۔ ۳۶
۴۔ کسی کا حق مار لینا ۔۔۔۔۔۔ (پرویز صاحب) ۔۔۔۔۔۔ ۳۸
۵۔ قائداعظمؒ اور مودودی صاحب کے تعلقات ۔۔۔۔۔۔ ۴۱
۶۔ طلوعِ اسلام کی سالانہ کنونشن ۔۔۔۔۔۔ ۴۸
۷۔ ویٹ نام کا عالمی کردار ۔۔۔۔۔۔ (خورشید عالم صاحب) ۔۔۔۔۔۔ ۴۹
۸۔ رابطۂ باہمی ۔۔۔۔۔۔ ۵۶
۹۔ علمائے کرام ۔ ایک عالم کی نظر میں ۔۔۔۔۔۔ ۵۷
۱۰۔ ملائیت ۔ ایک تاریخی جائزہ ۔۔۔۔۔۔ (پروفیسر محمد قاسم مظہر صاحب) ۔۔۔۔۔۔ ۵۹
۱۱۔ نقد و نظر ۔۔۔۔۔۔ ۶۳
۱۲۔ مطالب الفرقان ۔۔۔۔۔۔ ۶۵ ۔ ۸۰



(ایڈیٹر محمد خلیل ناشر سراج الحق) (مقام اشاعت ۔ ۲۵/ بی گلبرگ لاہور) (پرنٹر ۔ شیخ محمد اشرف) (مطبوعہ اشرف پریس ایبک روڈ لاہور)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# لمعات

آئندہ انتخابات میں ابھی دو سال سے زاید عرصہ باقی ہے لیکن اس ضمن میں، ملک کے قافلۂ انتشار کے طائرانِ پیش رس نے ابھی سے پر تولنے شروع کر دیتے ہیں اور الیکشن کو اسلامی خطوط پر لڑنے کی مہم کا آغاز ہو رہا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ الیکشن کے سلسلہ میں اسلامی اور غیر اسلامی کا معیار کیا ہے؟ اگر آپ کو معلوم نہ ہو تو اس نکتہ کو غور سے سمجھنے کی کوشش کیجئے کیونکہ جب سوال اسلامی اور غیر اسلامی کا درپیش ہو تو اس کا تعلق اسی دنیا سے نہیں بلکہ مسلمانوں کی عاقبت سے بھی ہوتا ہے۔ ۱۹۵۶ء کے (منسوخ شدہ) آئین کو اسلامی کہا جاتا ہے (کیونکہ اسے نظام اسلام پارٹی کے بانی چوہدری محمد علی صاحب نے مرتب فرمایا تھا) اس آئین کی رُو سے،

(۱) رائے دہندگان، صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کے ارکان کا انتخاب کرتے تھے۔ اور

(۲) ان اسمبلیوں کے ارکان، صدر کا انتخاب کرتے تھے۔

اس کے برعکس ۱۹۶۲ء کے آئین کی رُو سے،

(۱) رائے دہندگان بی۔ ڈی ممبروں کا انتخاب کرتے ہیں۔ اور

(۲) بی۔ ڈی ممبر، صدر کا انتخاب کرتے ہیں۔ (اور پارلیمانی ممبروں کا انتخاب بھی)

جہاں تک صدر کے انتخاب کا تعلق ہے (اور اسی کو زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے) بات سمٹ کر یوں ہو جاتی ہے کہ اگر صدر کا انتخاب پارلیمان کے ممبر کریں تو وہ انتخاب اسلامی ہوگا اور اگر اس کا انتخاب بی۔ ڈی ممبر کریں تو وہ غیر اسلامی ہوگا۔ ہم اس وقت بی۔ ڈی سسٹم کے حسن و قبح سے بحث نہیں کرنا چاہتے (انتخابات کے متعلق ہمارا معیار اور اصول بالکل مختلف ہے) ہم اس وقت صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ ملک کے اربابِ

دانش وبینش سوچیں کہ ان دونوں طریقوں میں سے ایک کو اسلامی کہنا اور دوسرے کو غیر اسلامی' اسلام کا مذاق اڑانا نہیں تو اور کیا ہے؟ قرآن کریم نے اس سلسلہ میں صرف اس قدر اصولی بات کہی ہے' کہ "تمہارے معاملات باہمی مشورہ سے طے ہونے چاہئیں" (۴۲/۳۸) اس مشاورت کا طریق کار کیا ہونا چاہیئے اسے اس نے امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے کہ اسے وہ' اپنے زمانے کے حالات کے مطابق' خود متعین کرے۔ جو نسا طریق بھی اس مقصد کے حصول کا مؤثر ذریعہ بن سکے' وہ "اسلامی" ہوگا۔ لہٰذا' ان ذرائع سے متعلق گفتگو ان کے حسن و قبح (MERITS) کو سامنے رکھ کر کرنی چاہیئے کسی فرد یا پارٹی کا خود ہی یہ فیصلہ کر لینا کہ جس طریق کو ہم پسند اور تجویز کرتے ہیں' وہ اسلامی ہے' عوام کے مذہبی جذبات کا استحصال (EXPLOITATION) ہے۔ اس مقصد کے لئے ٹیکنیک یہ اختیار کی جاتی ہے کہ پہلے عوام کے دل میں یہ بات بٹھا دی کہ اسلام کے جملہ حقوق ایک خاص گروہ کے حق میں محفوظ ہیں۔ ان کے علاوہ کسی اور کو اسلام کا نام لینے کا حق حاصل نہیں۔ اس کے بعد' جس بات میں اپنا فائدہ نظر آتے اسے اسلامی کہہ دیا اور اس کے خلاف جو کچھ کہا جائے اسے غیر اسلامی قرار دیکر مردود و مطرود ٹھہرا دیا۔ فریق مخالف اپنے موقف کی تائید میں ہزار دلیلیں پیش کرے ان سب کا دو حرفی جواب دے دیا جاتا ہے کہ یہ موقف غیر اسلامی ہے۔ اس کے بعد کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اگر وہ اپنی بات پر اصرار کرے تو دہائی مچا دی جاتی ہے کہ پاکستان کو اسلئے حاصل کیا گیا تھا کہ یہاں اسلامی نظامِ زندگی رائج کیا جائے اور ان لوگوں کو دیکھئے کہ کس دھڑلے سے یہاں غیر اسلامی شعائر نافذ کرنا چاہتے ہیں؟ ہم ایسا کبھی نہیں ہونے دینگے۔ ہم اسلام کی خاطر ہر قربانی دینے کے لئے تیار ہیں۔ ہم جیل میں چلے جائینگے، ہم تختہ دار پر چڑھ جائینگے، لیکن پاکستان میں غیر اسلامی طرز و اسالیب کو کبھی فروغ نہیں پانے دینگے (نعرۂ تکبیر۔ اللہ اکبر)

آپ سوچئے کہ اس قسم کی فضا میں کسی سوال کے متعلق علم و بصیرت کی رُو سے سوچا اور دلیل و برہان کی رُو سے اس کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے؟ آپ غور کیجئے کہ وہی اسلام جو زندگی کے ہر مشکل مسئلہ کا نہایت کامیاب حل عطا کرنے کے لئے آیا تھا جب اس قسم کے لوگوں کے ہتھے چڑھ جاتے تو وہ کس طرح امت کے لئے ہر حل کا دروازہ بند کر دیتا ہے۔

---

مغرب کی جمہوریت کا (جسے ہم نے اپنے ہاں رائج کر رکھا ہے) بنیادی نقص وہ نہیں جسے اس طرح اسلام کا نام لے کر اچھالا جا رہا ہے۔ اس کا بنیادی نقص اور ہے جس کی طرف کہیں سے اشارہ بھی نہیں کیا جاتا۔ مغربی نظامِ جمہوریت کی بنیاد اس دعوے پر ہے کہ اس میں لوگ اپنے لئے آپ

نظامِ حکومت تجویز کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر، اس میں حاکم و محکوم کی تفریق مٹ جاتی ہے۔ لوگ خود ہی حاکم ہوتے ہیں اور خود ہی محکوم۔ (ہم اس وقت ان بلند آہنگ دعاوی کے کھوکھلاپن کے متعلق گفتگو نہیں کرنا چاہتے۔ اس سلسلہ میں ہم اس سے پہلے بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔) اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے ایک مشینری وضع کی ہے، اور وہ یہ کہ لوگ اپنے نمائندے منتخب کریں۔ یہ نمائندے نظم و نسقِ مملکت کے متعلق فیصلے کریں۔ چونکہ یہ عوام کے نمائندے ہونگے اس لئے ان کے فیصلے بالواسطہ خود عوام کے فیصلے سمجھے جائیں گے۔ یوں لوگ خود اپنے فیصلوں کی پابندی کریں گے۔ لہٰذا وہ کسی غیر کے محکوم نہیں ہوں گے۔ یہ سوال خود مغربی ممالک میں بھی زیرِ بحث چلا آرہا ہے کہ جن لوگوں کو عوام کے نمائندے کہا جاتا ہے کیا وہ فی الواقعہ عوام کے نمائندے ہوتے ہیں، اور کیا ان کے فیصلے واقعی خود عوام کے اپنے فیصلے کہلا سکتے ہیں؟ وہاں ان امور کے متعلق کس انداز سے گفتگو ہوتی ہے اور اس کے موافق یا مخالف کیا کیا دلائل دیئے جاتے ہیں، ہم اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے۔ ہم دیکھنا یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے ہاں جو لوگ عوام کے نمائندے بن کر شریکِ حکومت ہوتے ہیں، کیا وہ فی الواقعہ عوام کے نمائندے ہوتے ہیں؟ بات سمجھنے کے لئے فرض کیجئے کہ ایک حلقۂ انتخاب میں دو کارخانے ہیں اور دو سو مزدور ان کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور۔ ان کارخانوں کے مالک ایک نشست کے لئے بطور امیدوار کھڑے ہوتے ہیں اور ان میں سے ایک کامیاب ہو جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس کارخانے کا مالک ان مزدوروں کا نمائندہ کہلا سکتا ہے جن کے ووٹوں سے یہ منتخب ہوا ہے؟ مزدوروں کا نمائندہ مل کا مالک کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ ان کی نمائندگی کیسے کر سکتا ہے؟ مل کے مالک کے اور مزدوروں کے مفاد آپس میں ٹکراتے ہیں۔ آپ سوچئے کہ یہ مل کا مالک کسی صورت میں بھی اپنے مفاد کو قربان کر کے مزدوروں کے مفاد کا تحفظ کرے گا؟ آپ کہیں گے کہ ان مزدوروں نے اسے ووٹ کیوں دیئے؟ وہ اگر اسے ووٹ نہ دیتے تو دوسرا بھی تو مل کا مالک ہی تھا، اسے ووٹ دیتے تو وہ بھی یہی کچھ کرتا۔ ان مزدوروں کے لئے، اس کے سوا چارہ کار ہی نہ تھا کہ وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو ووٹ دیتے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ مزدور خود اپنے میں سے کسی کو بطور امیدوار کھڑا کر سکتے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ ایسا کر سکتے تھے۔ لیکن، بہ حالاتِ موجودہ، کیا یہ ممکن تھا کہ یہ مزدور امیدوار، مل کے مالک کے مقابلہ میں کامیاب ہو جاتا؟ ہم جیسے غیر یا نیم ترقی یافتہ ممالک تو ایک طرف، اس کا امکان تو ہنوز ان ممالک میں بھی نہیں جہاں عوام کا سیاسی شعور بیدار ہے اور وہ اپنی روٹی کے لئے بالادست طبقہ کے اس قدر دست نگر بھی نہیں۔

کارخانوں سے پیچھے ہٹ کر شہر کے محلوں کی طرف آجائیے۔ وہاں بھی یہی کیفیت نظر آئے گی۔ ووٹ دینے والے عوام غریب ہونگے اور امیدوار محلہ کے چوہدری (جواب دولتمند کا دوسرا نام ہے) ان عوام میں سے کس کی مجال ہے کہ ان کے مقابلہ میں کھڑا ہو جائے یا کھڑا ہو کر کامیاب ہو جائے۔ محلوں سے بھی کوئی نہ کوئی "چوہدری" ہی منتخب ہو کر، عوام کے نمائندہ کی حیثیت سے، اوپر پہنچے گا۔ شہروں سے باہر نکل کر، دیہاتی علاقوں میں جائیے۔ وہاں حالت اس سے بھی بدتر دکھائی دے گی۔ وہاں ووٹ دینے والے مزارع یا کمزور کاشتکار ہونگے۔ اور امیدوار بڑے بڑے سردار۔ ان کے مقابلہ میں کسی مزارع کے سر اٹھا کر چلنے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا چہ جائیکہ وہ الیکشن میں ان کا مقابلہ کرنے کے لئے کھڑا ہو جائے۔ ان مزارعوں اور کاشتکاروں کے نمائندے یہی بڑے بڑے زمیندار ہونگے، جن کے مفاد قدم قدم پر ان غریبوں کے مفاد سے ٹکراتے ہیں۔ آپ سوچئے کہ بی۔ ڈی ممبر ہوں یا پارلیمان کے ارکان، ان میں سے کسی کو بھی آپ اس اسی نوے فیصد آبادی کا نمائندہ کہہ سکتے ہیں جن کی نمائندگی کرنے کے یہ مدعی ہیں! جب حقیقت حال یہ ہے تو آپ کسی صورت میں بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ——

GOVERNMENT OF THE PEOPLE, BY THE PEOPLE, FOR THE PEOPLE

ہے؟ اس نظام کو اگر واقعی جمہوری نظام بنانا مقصود ہے تو اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہے، کہ حلقہ ہائے انتخاب، آمدنی کے معیار کے مطابق متعین کئے جائیں۔ مثلاً سو روپیہ ماہوار آمدنی والے افراد پر مشتمل ایک حلقہ۔ ان افراد کی تعداد کی نسبت سے اس میں نشستوں کا تعین۔ اور اسکے بعد شرط یہ کہ اس حلقہ میں سے امیدوار وہی کھڑے ہو سکتے ہیں جن کی آمدنی اتنی ہو۔ اسی شکل کو آگے بڑھاتے جائیے۔ مثلاً سو سے پانچ سو روپے ماہوار آمدنی والوں کا الگ حلقۂ انتخاب — اور امیدوار بھی انہی میں سے۔ اسے اسی طرح بڑھاتے بڑھاتے آپ لاکھوں روپے ماہوار آمدنی تک لے جائیے۔ ظاہر ہے کہ جوں جوں ہم اوپر اٹھتے جائیں گے نشستوں کی تعداد کم ہوتی جائے گی۔ اور آخری نتیجہ یہ ہوگا کہ (خواہ بی۔ ڈی ممبر ہوں اور خواہ پارلیمانی ارکان) پورے کا پورا ایوان، قوم کے صحیح نمائندگان پر مشتمل ہوگا۔ اور ان میں اکثریت ان کی ہوگی جن کی بلحاظ آبادی ملک میں اکثریت ہوگی۔ اس پر ہم اتنا اضافہ اور کرنا چاہیں گے کہ امیدواروں کے لئے کم از کم تعلیم کی شرط بھی ضرور عاید ہونی چاہیئے۔ اس کے لئے تعلیمی معیار بھی آمدنی کی نسبت سے رکھا جائے۔ سو روپیہ ماہوار آمدنی والوں کے لئے پرائمری

یا مڈل تک کی شرط ہی کافی ہے۔ جوں جوں اوپر اٹھتے جائیں تعلیمی معیار بھی بلند ہوتا جائے۔ صدارت کے لئے البتہ معیار آمدنی نہیں، صرف تعلیم رکھا جائے۔ کیونکہ صدر مملکت کسی خاص حلقۂ انتخاب کا نمائندہ نہیں ہوتا، پورے ملک کا نمائندہ ہوتا ہے۔

اس طریقِ انتخاب کی رُو سے (علاوہ اس کے کہ قوم کے نمائندے فی الواقعہ قوم کے نمائندے ہونگے) سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ الیکشن کی خرابیاں (جن کا ہم اس قدر رونا روتے رہتے ہیں) خود بخود دور ہوجائیں گی۔ سو روپیہ ماہوار آمدنی والا امیدوار، اپنے دوڑوں کو رشوت کہاں سے دے گا اور جھوٹے سچے پراپیگنڈے کے لئے رقم کہاں سے لائے گا؟ اور لاکھ روپیہ ماہوار آمدنی والا اگر رشوت دینا چاہے گا، تو اس کے دوڑ بھی اُسی کی حیثیت کے ہونگے۔ انہیں خریدنے کے لئے اُسے خود بکنا پڑے گا۔

---

یہ تو رہا عام آبادی کی نمائندگی کا سوال۔ جہاں تک خصوصی مفادات کا تعلق ہے، ان کے لئے ایک ایوانِ بالا (SENATE) کا ہونا ضروری ہے "خصوصی مفادات" سے ہماری مراد ہے (مثلاً) ڈاکٹر، وکلا، جج صاحبان، اساتذہ، اہل قلم، سائنٹیفک تحقیقات کے ماہر، صنعت و حرفت، تجارت، زراعت وغیرہ۔ ان کے لئے یہی انتخابی حلقے ہوں۔ وہی ووٹ دینے والے، اور انہی میں سے امیدوار، ایوانِ زیریں اور بالا کے باہمی تعلقات اور دوائرِ اختیار کا فیصلہ آئینی طور پر کیا جا سکتا ہے۔

---

نظامِ مملکت میں سب سے اہم فریضہ قانون سازی کا ہے۔ مغربی جمہوریت میں، قوم کے نمائندوں کو قانون سازی کا کُلی اختیار ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ نظام، اسلام کے یکسر خلاف ہے۔ اسلام میں انسانوں کو قانون سازی کا حق صرف ان حدود کے اندر حاصل ہوتا ہے جنہیں خدا نے قرآنِ کریم میں متعین کر دیا ہے۔ یہ حدود ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہتی ہیں اور ان کے اندر رہتے ہوئے جو قوانین مرتب کئے جائیں ان میں زمانے کی ضروریات کے مطابق ردوبدل کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے آئین میں یہ شرط موجود ہے کہ ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کیا جا سکتا جو "کتاب و سنت" کے خلاف ہو۔ اس شرط نے، نمائندگانِ قوم کے قانون سازی کے اختیارات کو محدود کر دیا ہے۔ لیکن یہ شرط ایسی ہے جس پر کما حقہٗ عمل ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے یہ حد بندی بھی محض "دل کے خوش کرنے" کے لئے ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے ہم بیس سال سے دہراتے چلے آرہے ہیں۔ اور اس کا جواب کفر کے فتووں کے سوا کسی کے پاس کچھ نہیں۔ اسے آپ ایک عملی مثال سے سمجھئے۔ قرآن کریم میں وصیت کے

متعلق ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۨ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ؕ (۲/۱۸۰)

جب تم میں سے کسی کے سامنے موت آکھڑی ہو اور وہ کچھ مال چھوڑے تو اس پر فرض ہے کہ وہ انصاف کے ساتھ اپنے ماں باپ اور رشتے داروں کے لئے وصیت کرے۔ ایسا کرنا متقیوں پر لازم ہے۔

یہاں سے واضح ہے کہ خدا کی طرف سے ہر مسلمان کے لئے یہ حکم ہے کہ وہ اپنے ترکہ کے لئے اپنے ماں باپ اور دیگر رشتہ داروں کے لئے وصیت کر کے مرے۔ اتنا ہی نہیں۔ دوسری جگہ وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ یہ وصیت کس طرح لکھی جائے، کون لکھے۔ گواہ کون ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔ (دیکھئے ۵/۱۰۶)۔ پھر سورۂ نساء میں جہاں تقسیم وراثت سے متعلق احکام آتے ہیں، وہاں مختلف حصے بیان کرنے کے بعد کہا ہے۔ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ (۴/۱۱) یہ حصے اس وصیت کو پورا کرنے کے بعد دیئے جائیں جو متوفی نے کی ہو۔ نیز اس کا قرضہ ادا کرنے کے بعد۔ اور یہ الفاظ ایک مرتبہ نہیں، تین مرتبہ دہرائے گئے ہیں کہ ترکہ کی تقسیم اس مال سے ہوگی جو وصیت پوری کرنے اور قرضہ کی ادائیگی کے بعد باقی بچے گی۔

یہ ہے قرآن کریم کا حکم۔ اس کے برعکس حدیث میں ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ وصیت صرف ایک تہائی مال میں کی جا سکتی ہے اور وہ بھی وارثین کے لئے نہیں۔

یعنی قرآن کریم پورے مال میں وصیت کا حکم دیتا ہے اور اس میں وارث بھی شامل ہیں، اور حدیث اس کے برعکس ایک تہائی مال میں وصیت کی اجازت دیتی ہے۔ اور وہ بھی وارثوں کے لئے نہیں۔

ہم ایک طرف ان ارباب حکومت کو جو آئین میں اس شرط کے داخل کرنے کے ذمہ دار ہیں (کہ کوئی قانون ایسا نہیں بنایا جائے گا جو کتاب و سنت کے خلاف ہو) اور دوسری طرف ان ارباب مذہب کو جو اس حکم کو سنتِ رسول اللہ قرار دیتے ہیں،

چیلنج دیتے ہیں کہ وہ وصیت کے متعلق ایسا قانون مرتب کر کے دکھائیں جو کتاب و سنت کے خلاف نہ ہو۔

آپ کوئی سا قانون بنائیے۔ وہ یا کتاب اللہ کے خلاف ہوگا، یا اس "سنتِ رسول اللہ" کے

خلاف! آپ قیامت تک ایسا قانون نہیں بنا سکتے جو ان دونوں شرطوں کو پورا کر سکے۔

یہ ہے اس شرط کی کیفیت جسے داخل آئین کرنے (اور کرانے) کے بعد، ڈھول پیٹا جا رہا ہے کہ ہم نے آئین کو اسلامی بنوا دیا ہے اور اس سے مملکت مسلمان ہو گئی ہے؟ اور یہ ہے وہ عملی دشواری جسے سامنے لانے کے جرم میں طلوع اسلام کو منکرِ سنت قرار دیا جا رہا ہے۔

یہ ہیں آئین پاکستان کے سلسلہ میں عملی سوالات، ان کی طرف تو کوئی توجہ نہیں دی جاتی اور سارا زور یہ ثابت کرنے میں صرف کیا جا رہا ہے کہ بالواسطہ انتخاب غیر اسلامی ہے (کیونکہ وہ صدر ایوب کا تجویز کردہ ہے) اور بلاواسطہ انتخاب اسلامی ہے (کیوں کہ ایسا ہم کہتے ہیں!) اگر اس آئین کو واقعی اسلامی روح اور قرآنی احکام کے قریب تر لانے کی نیت ہے تو اس کے لئے

(۱) طریقِ انتخاب میں ایسی تبدیلی کیجئے جس کی رو سے، ہر طبقہ کی نمائندگی اسی طبقہ سے متعلق امیدوار کرے۔ غریب کا نمائندہ غریب، امیر کا نمائندہ امیر۔ جب قرآنِ کریم نے اولوالامر (اربابِ اختیار) کے لئے مِنکُم کی شرط عاید کی تھی (یعنے وہ تم ہی سے ہوں) تو (موجودہ حالات میں جب قوم طبقوں میں بٹی ہوئی ہے) مِنکُم کی شرط اسی طرح پوری ہو سکتی ہے۔ جو شخص پلاؤ کھا کر لیٹا ہوا ہو، بھوکے اسے اپنے میں سے نہیں سمجھ سکتے۔ اس لئے وہ ان کی نمائندگی نہیں کر سکتا۔ اور

(۲) آئین میں یہ شرط داخل کیجئے کہ ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہو سکتا جو کتاب اللہ کے خلاف ہو۔ اس سے عملاً ایسے قوانین بن سکیں گے جو خدا کی مرضی کو پورا کریں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ ایک ایسا ادارہ موجود ہو، (مثلاً عدالتِ عالیہ) جو کسی کی شکایت پر یہ فیصلہ دے سکے، کہ مملکت کا فلاں قانون قرآن کے مطابق ہے یا نہیں اور اس ادارہ کا فیصلہ حکومت اور عوام دونوں کے لئے قولِ فیصل ہو۔

ملک کو اسلامی بنانا ہے تو ان خطوط پر آئینی جدوجہد کیجئے۔ اور اگر مقصد مفادِ خویش کا حصول ہی ہے تو پھر اسلام کا نقاب الگ کر کے کھلے بندوں بات کیجئے ۔۔۔

یا چناں کن یا چنیں

پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم ۔۔۔ بروز اتوار۔ بوقت ۸½ بجے صبح
۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

# شفق رنگ یادوں کے چراغ

پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصور نے لیا اس بزم میں جانے کا نام

۸ ستمبر ۱۹۶۷ء کی سہ پہر، بزم طلوع اسلام لاہور کے زیر اہتمام، وائی - ایم - سی - اے - ہال میں، یوم دفاع کے سلسلہ میں ایک جلسۂ عام، میں پرویز صاحب نے برجستہ تقریر کی تھی - جسے ٹیپ کر لیا گیا تھا - وہ اب پیش خدمتِ قارئین ہے - (طلوع اسلام)

صدر محترم و عزیزانِ گرامی قدر!

جب سے آسمان نے اپنی آنکھ کھولی ہے، اس نے خطۂ ارض کو سلسلۂ روز و شب میں گرفتار پایا ہے. ایک معین وقت پر صبح نمودار ہوتی ہے - سورج کی کشتی سیمیں ایک خاص راستہ طے کر کے، شام کے وقت، افق کے اُس پار، غرقِ بحرِ نیل ہو جاتی ہے، اس سے دن کا خاتمہ اور رات کا آغاز ہوتا ہے - پھر دوسری صبح سے، اسی دائرہ کا از سرِ نو آغاز ہو جاتا ہے - صبح اور شام کا یہ لامتناہی چکر، ازل سے شروع ہے اور ابد تک اسی طرح چلا جائے گا - لیکن روز و شب کے اس سلسلۂ دراز میں بعض دن ایسے بھی آجاتے ہیں جنہیں خدا "ایام اللہ" - یعنے اللہ کے اپنے دن، کہہ کر پکارتا ہے - یوں تو وہ کون سا دن ہے جو اللہ کا نہیں - لیکن ظاہر ہے کہ جن دنوں کو خدا خود اپنے دن کہتا ہے، ان میں کوئی بہت بڑی خصوصیت ہو گی - یہ خصوصیت کیا ہے،

اس کی تشریح خود قرآن نے اس مقام پر کردی ہے جہاں حضور نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے کہ

وَذَكِّرْهُمْ بِأَيَّامِ اللَّهِ ۔ (۱۴/۵)

انہیں خدا کے دنوں کی یاد دلاؤ۔

**ایّام اللہ** اور اس کے بعد کہا ہے کہ ان دنوں میں سے ایک دن وہ ہے جب بنی اسرائیل کی مظلوم ومقہور، محکوم ومغلوب قوم کو، فرعون کے جور واستبداد سے نجات دلا کر، انہیں ایک آزاد مملکت عطا کردی گئی تھی۔ لہٰذا "اللہ کے دن" وہ ہیں جن میں حق و باطل کا کوئی عظیم معرکہ برپا ہوا ہو۔ اور اس میں حق کی حمایت کرنے والی قوتیں، عدل و انصاف کا پرچم بلند کئے، فاتح و منصور رزمگاہ سے واپس آئیں۔ اسی قسم کا ایک دن، آج سے ٹھیک دو سال پہلے، ہماری تاریخ میں بھی آیا تھا، کہ جس کی یاد اِن دنوں ملک کے طول وعرض میں نہایت تزک واحترام سے منائی جارہی ہے اور جس میں شرکت کے لئے ہم اس وقت یہاں جمع ہوئے ہیں۔ خدا کے اس عظیم دن کی یاد کو ہمیں ماضی کے دھندلکوں میں تلاش نہیں کرنا پڑتا۔ اس کے لئے نہ ہمیں تاریخ کے کِرم خوردہ نوشتوں کا رہینِ منت ہونا پڑتا ہے نہ وقت کے غبار آلود کھنڈرات کا زیر بار احسان۔ یہ ہمارا آنکھوں دیکھا ماجرا ہے۔ اس کی چلتی پھرتی تصویریں، ہمارے آئینۂ چشم میں محفوظ، اور اس کے کوائف ومناظر ہمارے لوحِ قلب پر مرتسم ہیں۔ اس کی جزئیات تک ہمارے ذہنوں میں منقوش، اور اس کے تاثرات ہمارے سینوں میں دل کی دھڑکنیں بن کر مستور ہیں۔ یوں تو یہ معرکہ پورے کے پورے پاکستان کے لئے ساعتِ قیامت سے کم نہ تھا، لیکن ہم اہلِ لاہور تو گویا بہ نفسِ نفیس اس عرصۂ محشر میں شریک تھے۔ اِس وقت، جب میں، بیم ورجا کے اُن جانگسل لمحات کو اپنے حافظہ کے ریکارڈ سے چشمِ تصور کے سامنے لارہا ہوں اُن دھماکوں کی آواز مسلسل میرے کانوں میں آرہی ہے جو آج سے دو سال پہلے، ٹھیک اسی وقت، کبھی پیامِ موت بنتے تھے، کبھی نشیدِ حیات۔ یہ وہ وقت تھا جب ہماری عزت وناموس اور وحشی رہزنوں اور عفریتی قزاقوں کے درمیان فقط نہر کا ایک چھوٹا سا پُل حائل تھا۔ اس وقت میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر پھر رہا ہے جب واہگہ کی طرف سے آتشیں گولے اٹھا اٹھ کر خارجی فضا میں تحرک اور ہماری داخلی دنیا میں ارتعاش پیدا کر رہے تھے۔ اُس وقت میرے گرد وپیش کچھ معصوم بچے، غباروں سے کھیل رہے تھے۔ میری نگاہیں کبھی اُن آتشیں گولوں کی طرف اٹھتیں اور کبھی ان ننھے معصوموں کے مستقبل کی طرف۔ میں ان احساسات کو جن سے اُس وقت میرا خون منجمد ہو رہا تھا، کیسے بھلا سکتا ہوں؟ اس سے بھی بڑھ کر وہ منظر کہ اُدھر سے میرے کانوں میں سکھ "سورماؤں" اور مرہٹہ "بلوانوں" کے پاؤں کی آہٹ آرہی تھی اور اِدھر میری آنکھوں کے سامنے وہ جوان بیٹیاں اور بہنیں پھر رہی تھیں جن کے کھلے سر کو آسمان کی آنکھ کے سوا کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ سوچئے

کہ میں ان تاثرات کو کیسے فراموش کر سکتا ہوں! ۔ نہیں! اس سے ایک قدم اور آگے بڑھیئے اور اس واقعہ کو سامنے لائیے کہ دوپہر کے وقت جب میں اپنی بچیوں کے ہاتھ میں بندوق دے کر کہہ رہا تھا کہ بیٹیو! اگر خدانخواستہ ایسا وقت آجائے کہ دشمن ہمارے دروازے تک آپہنچے اور ہم ختم ہو چکے ہوں تو تم اس بندوق سے اپنا خاتمہ کر لینا، سوچئے کہ یہ احساسات ہمارے لوحِ شعور بلکہ تحت الشعور سے کبھی مٹ سکتے ہیں! لیکن ہم آج ان تاثرات کو ابھار کر سامنے لانے کے لئے جمع نہیں ہوئے۔ ہم جمع ہوئے ہیں اس لئے کہ بیم و رجا کے اس روح فرسا عالم اور موت و حیات کی اس جانکاہ کشمکش، میں جن نونہالانِ ملت نے اپنی جان ہتھیلیوں پر رکھ کر اور اپنا سر دے کر، ہماری متاعِ حیات، ہمارے بچوں کے مستقبل، ہماری بیٹیوں اور بہنوں کی ناموس، ہماری قوم کی آبرو، ہمارے وطن کی عزت اور امتِ مسلمہ کے وقار کو بچا لیا اور ہمیں دنیا میں سر اونچا کر کے چلنے کے قابل بنا دیا، ان کے قدموں پر ہم تحسین و تبریک کے سدا بہار پھول نچھاور کریں، اور بارگاہِ خداوندی میں اپنے قلبی تشکر و امتنان کے سجدے گزرانیں۔ اور یوں ہم، اللہ کے ان دنوں کی یاد تازہ کریں۔ کہ قدر حیات آور ہیں ان کی یہ حسین یادیں، اور کیسے جنت بداماں ہیں ان یادوں کے تاثرات! ؎

فرشتے پونچھ لیتے ہیں میرے رخسار سے آنسو!
الٰہی! آج کس کی یاد میں شبنم فشاں ہوں میں

---

## کشمکش کا آغاز

تاریخِ پاکستان میں، ایامِ اللہ کا یہ سلسلہ ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء سے شروع نہیں ہوتا۔ اس کی ابتدا، اس سے بہت پہلے، ۱۹۳۰ء میں ہو گئی تھی جب علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصور پیش کیا تھا۔ اس کے بعد جب قائداعظمؒ نے اس تصور کو عملی پیکر عطا کرنے کے لئے تحریکِ پاکستان شروع کی تو اس کشمکش کی شدت اور تیز ہو گئی۔ اس میں ہندو، انگریز اور مخالفین پاکستان مسلمان، (نیشنلسٹ لیڈر اور علماء، اور جماعتِ اسلامی) ایک طرف تھے اور قائداعظم اور ان کے رفقائے کار دوسری طرف۔ قریب دس سال کی کشمکشِ پیہم کے بعد، بالآخر (۱۹۴۷ء میں) تقسیم ہند کا فیصلہ ہو گیا اور اس طرح پاکستان وجود میں آگیا۔

یہ آئینی جنگ تھی اس لئے جب آئینی طور پر اس کا فیصلہ ہو گیا تو ہندو کو اسے بطیبِ خاطر قبول کر لینا چاہیئے تھا۔ لیکن ہندو کا تو منشا ہی کچھ اور تھا۔ آپ تاریخ ہند پر غور فرمایئے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس میں متعدد اقوام فاتحین کی حیثیت سے داخل ہوئیں۔ ان میں سے ہر ایک نے کچھ وقت کے لئے وہاں حکومت بھی کی۔ لیکن اس کے بعد وہ ہندوؤں کے اندر جذب ہو گئی۔ چنانچہ آج ان اقوام میں سے کسی کا جداگانہ تشخص ہندوستان میں

کہیں نہیں ملتا۔ وہ سب ہندو قوم کا جزو بن چکی ہیں۔ لیکن مسلمان ایک ایسی سخت جان قوم واقع ہوئے تھے کہ صدیوں تک ہندوستان میں رہنے کے باوجود انہوں نے اپنا جداگانہ تشخص قائم رکھا جو ہندو کے سینے پر سانپ بن کر لوٹتا تھا۔ جب ان کی حکومت چھن گئی تو ہندو نے انگریز کے ساتھ مل کر ان کی ملی ہستی کو ختم کرنے کی مہم جاری کی۔ لیکن اس میں بھی اسے کامیابی نہ ہوئی۔ جب انگریز یہاں سے جانے کی تیاری کرنے لگا تو ہندو نے مسلمانوں کی قومی حیثیت کو ختم کرنے کے لئے ایک آخری حربہ استعمال کیا۔ اور یہ حربہ تھا انگریز کے چلے جانے کے بعد، ہندوستان میں جمہوری حکومت قائم کرنے کا منصوبہ۔ جمہوری حکومت سے مراد ہوتی ہے اکثریت کی حکومت۔ انگریز کے دورِ حکومت کے آخر میں، مسلمانوں کی تعداد، ہندوؤں کے مقابلہ میں ایک چوتھائی تھی۔ لہٰذا، آئینِ جمہوریت کی رُو سے، مسلمان کے لئے، ہندو کی ابدی غلامی مقدر ہو جاتی تھی۔ ہندو خوش تھا کہ جو مقصد وہ بہزار تدبیر صدیوں سے حاصل نہ کر سکا تھا، وہ اب یوں نہایت آسانی سے ہاتھ آ جائے گا۔ لیکن قائداعظمؒ کی ایک ضربِ کلیمی نے، اس گئوسالہ سامری کو راکھ بنا کر، جمنا کی لہروں کی نذر کر دیا۔

## ہندو کا جذبۂ انتقام

لیکن اس سے اس کے انتقام کی آگ نہایت تیزی سے بھڑک اٹھی۔ اور اس نے تہیہ کر لیا کہ جو کام آئینی منتر نہیں کر سکے اسے شوشکتی (قوت) کے زور سے سرانجام دیا جائے گا۔ چنانچہ ۳ر جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کا آئینی فیصلہ ہوا۔ اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے، جو اس فیصلہ میں ایک نمایاں فریق کی حیثیت رکھتی تھی، ۱۴ر جون کو یہ ریزولیوشن پاس کیا کہ:۔

> آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو پورا پورا یقین ہے کہ جب موجودہ جذبات کی شدت میں کمی آ جائے گی تو ہندوستان کے مسئلہ کا حل صحیح پس منظر میں دریافت کر لیا جائے گا۔ اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو الگ الگ قومیں ہونے کا باطل نظریہ مردود قرار پا جائے گا۔

پنڈت جواہر لعل نہرو ایک طرف تقسیم ہند کی وسنتا ویز پر دستخط کر رہا تھا اور دوسری طرف اپنی قوم کے کان میں کہہ رہا تھا کہ:

> ہماری اسکیم یہ ہے کہ ہم اس وقت جناح کو پاکستان بنا لینے دیں اور اس کے بعد معاشی طور پر اور دیگر انداز سے، ایسے حالات پیدا کرتے جائیں جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنوں کے بل جھک کر ہم سے درخواست کرے کہ ہمیں پھر سے

ہندوستان میں مدغم کر لیجئے۔

(پاکستان فیسز انڈیا۔ از عزیز بیگ ص۹۹)

کانگریسی لیڈر جو کچھ دبی زبان سے کہہ رہے تھے، دوسرے ہندو لیڈر اسی بات کو کھلے الفاظ میں دہرا رہے تھے۔ چنانچہ راجہ مہندر پرتاب نے (۱۹۵۰ء میں) اعلانیہ کہا کہ:

جب تک پاکستان کا وجود ختم نہیں ہو جاتا ہمارا ملک کوئی ترقی نہیں کر سکتا۔ حالات اس طرح بدل رہے ہیں کہ مجھے یقین ہوتا چلا جا رہا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جنگ لا یفک ہو گئی ہے۔ بنابریں، میں حکومتِ ہند کو مشورہ دوں گا کہ وہ افغانستان کو اپنے ساتھ ملا کر، پاکستان کو ختم کر دے۔

(ویر بھارت مورخہ ۲۱ دسمبر ۱۹۵۰ء)

چنانچہ اب یہ حقیقت راز درونِ خانہ نہیں رہی کہ ہندوؤں نے دسمبر ۱۹۵۰ء میں فیصلہ کر لیا تھا کہ پاکستان پر حملہ کر کے اسے ختم کر دیا جائے۔ اس کے بعد دو دفعہ پھر اسی فیصلہ کو دہرایا گیا۔ لیکن حالات کو ناسازگار پاتے ہوئے وہ اسے ملتوی کرتے رہے۔ تا آنکہ جب انہوں نے پورا پورا اطمینان کر لیا کہ ان کے پاس اتنی قوت جمع ہو گئی ہے کہ پاکستان ان کے سامنے چند گھنٹوں تک کے لئے بھی نہیں ٹھہر سکے گا، تو انہوں نے، اپنی اکیس ڈویژن (یعنی چار لاکھ سے زیادہ) فوج سے، بغیر کسی اعلانِ جنگ کے، ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی شب، سپیدۂ سحر نمودار ہونے سے بہت پہلے، چوروں کی طرح دبے پاؤں، پاکستان پر اچانک ہلہ بول دیا ـــــ چار لاکھ فوج، ہزاروں کی تعداد میں ٹینک، بکتر بند گاڑیاں، نہنگ و اژدر سے زیادہ مہیب توپیں اور آسمان پر مون سون کی سیاہ گھٹاؤں کی طرح چھائے ہوئے ہوائی دستے۔

یہ اہتمام تھے، اور ایک مشت پر کے لئے!

دنیا کے کسی سیاسی مبصر کی آنکھ اور فنونِ جنگ کے ماہرین کا کوئی اندازہ، پاکستان کو چند گھنٹوں سے زیادہ زندہ رہنے کی مہلت دینے کے لئے تیار نہ تھا ـــــ لیکن سرزمینِ پاکستان کی خاک کے ذرے ان کے اندازوں کی ہنسی اڑا رہے تھے، اور جنرل چوہدری کی تدبیریں، لال بہادری شاستری کی قسمت کو رو رہی تھیں۔

---

## پاکستان کی حفاظت

اہلِ پاکستان کے لئے سوال، ایک خطۂ زمین کی حفاظت کا نہیں تھا۔ ان کے سامنے اس خطۂ زمین میں اسلام کے مستقبل کا سوال تھا۔

ان کے لئے سوال، بھارت اور پاکستان کے باہمی تصادم کا نہیں تھا۔ ان کے سامنے تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اب وقت آگیا ہے جب زمانہ بدر و حنین کی داستانوں کو از سرِ نو زندہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ معرکہ غزوۂ احزاب کا ہے جب باطل کی آندھیاں حق کا چراغ بجھانے کے لئے اُمنڈ کر آگئی تھیں۔ لیکن انہیں یقین تھا کہ ـــــ پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا ـــــ ہندو نے سمجھا تھا کہ اس کا مقابلہ پاکستانی سے ہے۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ اس کا حریف مسلمان ہے۔ اور تاریخ کے اوراق اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ: ؎

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلمان کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِ کلیم و خلیل

## مسلمان کسے کہتے ہیں

یہاں سے ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ وہ کون سا مسلمان ہے جو مٹ نہیں سکتا اور جس کی اذانوں سے سرِ کلیمؑ و خلیلؑ فاش ہوتا ہے؟

اس سلسلہ میں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ (مثال کے طور پر) اسلام ایک سوسائٹی کا نام ہے اور جو شخص اس سوسائٹی کا ممبر بنتا ہے اسے مسلمان کہتے ہیں جس طرح کوئی شخص پیدائشی طور پر کسی سوسائٹی کا ممبر نہیں ہوتا وہ برضا و رغبت اور بطیبِ خاطر کسی سوسائٹی کا ممبر بنتا ہے، اسی طرح کوئی شخص پیدائشی مسلمان نہیں ہوتا اسے برضا و رغبت اور سمجھ سوچ کر مسلمان بننا ہوتا ہے۔ قومی اعتبار سے بے شک ہر وہ بچہ جو مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو مسلمان ہی کہلاتا ہے اور اسے ایسا کہلانا بھی چاہیئے۔ لیکن جو مسلمان کبھی مٹ نہیں سکتا اور جس کی اذانوں سے سرِ کلیمؑ و خلیلؑ فاش ہوتا ہے، اسے مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہونے کے باوجود مسلمان ہونا پڑتا ہے۔ لیکن بات اس سے بھی واضح نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ ہمارے سامنے وہ غیر مسلم بھی ہیں جو مسلمان ہوتے ہیں۔ کیا وہ اس زمرہ میں شامل ہیں؟ اس کا جواب بھی نفی میں ہے۔ وہ بھی ہماری طرح مسلم قوم کے افراد ہی بنتے ہیں۔ قرآنی مسلمان ہونے کے لئے ایک معاہدہ پر دستخط کرنے ہوتے ہیں۔ اور اس معاہدہ کی شرائط یہ ہیں کہ ـــ (۱) اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ (۲) بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔ (۹/۱۱۱) مومن اپنا مال اور اپنی جان خدا کے ہاتھوں بیچ دیتا ہے اور اس کے عوض خدا اسے جنت عطا کر دیتا ہے۔ یہ ہیں اس معاہدہ کے دونوں گوشے۔ اس سے واضح ہے کہ جب کوئی شخص مسلمان ہوتا ہے تو اس کی جان اور مال اس کے اپنے نہیں رہتے۔ وہ انہیں فروخت کر دیتا ہے۔ وہ اسکے پاس اس وقت تک امانتاً رہتے ہیں جب تک خریدار انہیں طلب نہیں کرتا۔ اور دوسری بات یہ واضح ہے کہ جنت اسی کو مل سکتی ہے جو اس طرح اپنی جان اور مال بیچ دے۔ اسی لئے دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ۔ (۳/۱۴۲) ۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تم یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ یہ ابھی تک دیکھا ہی نہیں گیا کہ تم میں سے کون جہاد کرتا ہے اور کون مصائب و مشکلات کا مقابلہ ثابت قدمی سے کرتا ہے؟ سورۃ توبہ کی جس آیت میں معاہدہ کا ذکر ہے وہیں اس کی تشریح ان الفاظ میں آتی ہے کہ اس طرح اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ بیچ دینے والے، يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ ۔ (۹/۱۱۱) یہ لوگ خدا کی راہ میں، جنگ کے لئے باہر نکل آتے ہیں۔ پھر یا تو فاتح و منصور لوٹتے ہیں اور یا اپنا سر دیدیتے ہیں۔ یہ ہے وہ مسلمان جو کبھی مٹ نہیں سکتا۔ اور جس کی اذانوں سے سرِّ کلیمؑ و خلیلؑ فاش ہے ؎

یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

اس مسلمان کا مال تو بہرحال و بہرکیف، نظامِ خداوندی کی تحویل میں رہنا ہے، لیکن اس کے دعوائے ایمان کا حقیقی (TEST) اس وقت ہوتا ہے جب اسے جان دینے کے لئے آواز دی جاتی ہے۔

## موت کی حقیقت

موت اور حیات کے سلسلہ میں قرآن کریم میں ہے کہ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (۶۷/۲) ۔ زندگی اور موت کو پیدا ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ اس سے حسنِ عمل کی پرکھ ہو سکے۔ اقبالؔ کے الفاظ میں ؎

خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقامِ حیات
کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ ثبات

اور وہ "سرِّ کلیم و خلیل" جو اس کی اذانوں سے فاش ہوتا ہے اس کے سوا کیا ہے کہ وہ اس حقیقت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لیتا ہے۔ کہ

عشق ہے مرگِ باشرف، مرگ حیات بے شرف

وہ، ہندی مسلمانوں کے ترکش کے خدنگِ آخریں، سلطان ٹیپوؒ کے الفاظ میں اس راز کو پالیتا ہے کہ "شیر کی ایک دن کی زندگی بکری کی سو دن کی زندگی سے بہتر ہے۔" وہ اس سرِّ سراپردۂ جاں کو اپنے سامنے مشہود دیکھ لیتا ہے کہ

لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف

یہی ہیں وہ مسلمان جنہیں نوریانِ عرش جھک کر سلام کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ

فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَۃِ ۔ (۴۱/۳۱) ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق و دمساز ہیں اور اُخروی زندگی میں بھی تمہارے ہم دوش و ہم عناں ہونگے۔ اور یہی ہیں وہ مسلمان جن پر خود خدا یہ کہہ کر تبریک و تحسین کے پھول نچھاور کرتا ہے کہ ۔ اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَ رَحْمَۃٌ وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ ۔ (۲/۱۵۷) یہی ہیں جن پر خدا درود و سلام بھیجتا ہے اور یہی ہیں جو منزلِ انسانیت تک پہنچانے والی سیدھی راہ پر گامزن ہیں۔

## معیارِ صداقت

ہم نے دیکھا ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے حسنِ عمل کے پرکھنے کی کسوٹی موت ہے۔ اسی کو اس نے صداقت کا معیار بتایا ہے جب کہا ہے کہ ۔ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۔ (۲/۹۵) ۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو موت کی تمنا کر کے بتاؤ۔ یہی نہیں کہ جب موت آجائے تو اس وقت واویلا نہ مچاؤ۔ بلکہ یہ کہ مرنے کی تمنا کرو اپنے دل میں، جان دے دینے کی آرزو بیدار رکھو۔ ایسے وقت کے لئے دعائیں مانگو کہ تمہیں موت کا سامنا کرنا پڑے اور تم ہنس کر اسے گلے سے لگالو۔

لیکن قرآن تو جان کی حفاظت کی بھی بڑی تاکید کرتا ہے۔ اس کے نزدیک انسانی زندگی کس قدر قیمتی ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس نے کہا ہے کہ "جس نے کسی ایک جان کو بھی ناحق تلف کر دیا، یوں سمجھو گویا اس نے پوری نوعِ انسانی کو ہلاک کر دیا"۔ اس ارشادِ خداوندی میں کسی دوسرے کی جان کو ناحق تلف کر دینا ہی نہیں، خود اپنی جان کو ناحق تلف کر دینا بھی شامل ہے۔ یہاں سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جب قرآن، جان کی حفاظت کی اس قدر تاکید کرتا ہے تو پھر وہ جان دے دینے کو دعوائے ایمان کی صداقت کا معیار کیوں قرار دیتا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس اہم سوال کا جواب، میں نے ایک دفعہ اسی ہال میں، اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے دیا تھا کہ کیریکٹر کسے کہتے ہیں۔ اور اس کی وضاحت میں نے اپنی زبان کے ایک محاورہ سے کی تھی۔ وہ محاورہ یہ ہے کہ "مال صدقہ جان، جان صدقہ آبرو" ہر شخص مال و دولت کو عزیز رکھتا ہے ۔ اور اسے عزیز رکھنا بھی چاہیئے۔ لیکن اگر کبھی ایسا وقت آجائے کہ مال اور جان میں سے ایک ہی چیز محفوظ رہ سکتی ہو تو عقلمند وہ ہے جو اُس وقت جان کی حفاظت کے لئے مال کو قربان کر دے۔ یہاں تک بات ہر ایک کی سمجھ میں آجاتی ہے اور ایسا کرنے والے کو زیادہ سے زیادہ "عقلمند" کہا جا سکتا ہے۔ اس میں کیریکٹر کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ ہر سمجھدار انسان ایسا ہی کرتا ہے۔ کیریکٹر کا مقام اس سے آگے آتا ہے، جب انسان کی جان اور آبرو کی حفاظت میں (T/E) آپڑے۔ اس وقت جو شخص

جان دے کر آبرو بچالے، اسے صاحب کردار کہا جائے گا۔ یہ ہے مقامِ مومن۔ اس محاورہ میں آبرو کا لفظ درحقیقت ایک علامت (SYMBOL) ہے۔ دین کے لُغت میں اس کے لئے مستقل اقدار (PER-MANENT VALUES) کی اصطلاح آئی ہے۔ آبرو انہیں اقدار میں سے ایک قدر ہے۔ لہذا، مسلمان وہ ہے کہ جب جان اور مستقل اقدارِ انسانیت میں تصادم ہو، جب ان میں (TIE) آپڑے، تو وہ جان دیدے لیکن مستقل اقدار پر آنچ نہ آنے دے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ؎

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

عام حالات میں، زندگی، جان کو سنبھال کر رکھنے کا نام ہے۔ لیکن جب اس قسم کے تصادم کا مقام آجائے تو پھر جان کو سنبھال کر رکھنے کا نہیں، بلکہ ہنستے ہوئے جان دے دینے کا نام زندگی ہوتا ہے۔ زندگی کو طبعی پیمانوں (PHYSICAL MEASURES) سے ماپنے والوں کے نزدیک یہ موت ہے، لیکن اقدار کے پیمانوں سے ماپنے والوں کے نزدیک، یہی درحقیقت زندگی ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ:

وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ
بَلْ اَحْيَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ۔ (۲/۱۵۴)

جو اقدار خداوندی کی حفاظت میں جان دے دیں انہیں مردہ مت کہو۔ یہ
زندہ ہیں۔ لیکن، جو لوگ زندگی اور موت کو طبعی پیمانوں سے ماپتے ہیں
اُن کی سمجھ میں یہ بات نہیں آسکتی۔

## زندۂ جاوید

یہی تھے جان دے کر زندگی خریدنے والے وہ جیالے، جنہیں ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح، تاروں کی چھاؤں، مؤذن نے یہ کہہ کر نیند سے جگایا کہ اَلصَّلٰوةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ۔ اور جب وہ جاگ اٹھے تو انہیں پکار کر کہا کہ۔ حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ ـــ آؤ! لپک کر آؤ، دوڑ کر آؤ، کامیابیاں اور کامرانیاں تمہارے قدم چومنے کے لئے بیتاب ہیں۔ آج قرنہا قرن کے بعد آسمان کی آنکھ نے ایک نرالی سحر کو ضوفشاں ہوتے دیکھا ـــ وہ سحر جس سے لرزتا تھا شبستانِ وجود ـــ آج صدیوں کے بعد فضائے کائنات نے، ملّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں کا فرق محسوس کیا۔ وہ فرق جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
مُلّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

ان مجاہدین کے کانوں میں حی علے الفلاح کی نشید جانفزا پڑی اور یہ لبیک، اللّٰھم لبیک، کہتے ہوئے، تبسم بہ لب، شمشیر بدست و کفن بردوش، شاداں و فرحاں، پاکستان کی سرحدوں پر سینہ تان کر جا کھڑے ہوئے۔ جنگ کی ( STRATEGY ) انہیں نہر کے اس پار روک رہی تھی لیکن اُن کی بیتابیٔ تمنا انہیں پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ ؎

اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تُند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول!

انہیں معلوم تھا کہ ان کا مقابلہ دشمن کی چار لاکھ مسلح فوج سے ہے۔ جس کے پاس سینکڑوں دبابے (ٹینک)، ہزاروں بکتر بند گاڑیاں، آسمان پر ہوائی بمباروں کا ابرِ آتشیں بار، ان کے پیچھے ایک پورا ابرِ اعظم ان کی پشت پناہی کے لئے، اس کے علاوہ بیرونی طاقتوں کی امداد، ـــ اس احساس سے ان کے دل کی کیفیت کیا ہوتی، یہ مجھ سے نہیں، قرآن کریم سے سنیئے، جس نے وجد و مسرت کے پُر کیف عالم میں کہا تھا کہ:

اَلَّذِیْنَ قَالَ لَھُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَکُمْ فَاخْشَوْھُمْ ۔ فَزَادَھُمْ اِیْمَانًا ۔ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَ نِعْمَ الْوَکِیْلُ۔ (۳/۱۷۲)

یہ وہ جیالے تھے کہ جب لوگوں نے ان سے کہا کہ دشمن نے تمہارے خلاف ایک لشکرِ عظیم جمع کر رکھا ہے تم اس سے ڈرو، تو اس سے ان کا ایمان اور بڑھ گیا۔ اور انہوں نے سکون و اطمینان کی ایک جنت قلوب میں لئے ہوئے کہا کہ اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟ خدا دارم چہ غم دارم۔

اس کے بعد، بارہ سومیل پر پھیلی ہوئی اس رزمگاہ میں جو کچھ ہوا، اس پر زمین حیرت میں ہے۔ آسمان

**تحیّر انگیز**

حیرت میں ہے۔ تاریخ حیرت میں ہے، وقت حیرت میں ہے۔ اس پر مؤرخ حیران ہے سیاسی مبصر حیران، غیر ملکی نامہ نگار آج تک متعجب ہیں، دنیا کے ماہرینِ فنونِ جنگ

ورطۂ حیرت میں گم ہیں۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ یہ کچھ کیسے ہوگیا؟ غیر تو ایک طرف خود اپنوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور کیسے ہو رہا ہے۔ وہ باور ہی نہیں کر سکتے تھے کہ انسان بھی یہ کچھ کر سکتا ہے ان کے تخیّر کی فراوانی اور عقلِ ریاضی دان کی بے بسی تھی جس کی بنا پر ان کا تخیل اس قسم کے افسانے وضع کرنے پر مجبور ہوگیا کہ یہ کچھ ان لوگوں کے ہاتھوں سے نہیں ہوا، فوق الفطرت قوتوں کی طرف سے ہوا ہے۔ وہ اپنی جگہ سچے تھے۔ بات صرف اتنی تھی کہ انہیں اس کا علم نہیں تھا کہ ؎

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

یہ بال و پرِ روح الامیں، آسمان سے نہیں اترا کرتے۔ یہ، موت سے نہ ڈرنے والے، مجاہدین کے خونِ جگر میں پوشیدہ، اور جوششِ کردار سے خود اُن کے بازوؤں سے نمودار ہوتے ہیں۔ اسی کا نام ملائکہ کا نزول اور خدا کی نصرت ہوتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کا ہاتھ خود اللہ کا ہاتھ بن جاتا ہے، اور خدا خود اس کی شہادت دیتا ہے جب وہ (مجاہدینِ بدر کو مخاطب کر کے) کہتا ہے کہ فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ ۔ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ ۔ (۸/۱۷)۔ تم دشمن کو قتل نہیں کر رہے تھے، ہم کر رہے تھے۔ تم ان پر تیر نہیں چلا رہے تھے، ہم چلا رہے تھے ــــ یہی وہ مقام ہے جہاں کہا جاتا ہے کہ ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

**یہ فرق کیوں؟** یہی وہ فرق ہے جس کی وجہ سے قرآنِ کریم نے جماعتِ مومنین سے کہا ہے کہ اگر سامانِ حرب کی کمی نہ ہو، تو مسلمان کا ایک سپاہی، مخالفین کے دس سپاہیوں پر غالب آسکتا ہے۔ اور اسلحہ کی نسبتاً کمی کی صورت میں بھی وہ اپنے سے کم از کم دگنی تعداد کو مغلوب کر سکتا ہے۔ اس فرق کی بنیادی وجہ وہی ہے جسے میں نے اُس محاورہ میں بیان کیا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں اول تو ماں ہی کم عزیز نہیں ہوتا۔ ایسے واقعات اکثر سننے میں آتے تھے کہ لالہ جی نے جان دے دی لیکن اپنے علاج کے لئے ایک پیسہ خرچ کرنے کا حوصلہ نہ کیا۔ لیکن اگر وہ مال خرچ کر بھی دے، تو بھی اس کے نزدیک جان سے زیادہ عزیز کوئی شے نہیں۔ اس لئے وہ اپنی جان کی حفاظت کو زندگی کا آخری فریضہ سمجھتا ہے۔ جس قوم کی زبان میں "شہید" کے لئے کوئی لفظ ہی نہ ہو، وہ کیا جانے کہ دنیا میں کوئی ایسی شے بھی ہے جس کی خاطر انسان جان تک بھی دے دیتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب دہلی میں سوامی شردھانند کو قتل کیا

گیا تو (مسلمانوں کی دیکھا دیکھی) ہندو، انہیں "شہید" کہنا چاہتے تھے۔ لیکن شہید کے لئے انہیں ہندی زبان میں کوئی لفظ نہیں ملتا تھا۔ اس لئے جب ان کی یاد میں تیجے اخبار جاری ہوا تو اس کی پیشانی پر "سوامی شردھانند شہید" ہی لکھا گیا۔ بعد میں انہوں نے ایک لفظ "امر" وضع کیا۔ جس کے معنی "زندۂ جاوید" کے ہوتے ہیں۔ حق کی خاطر جان دینے والے کے لئے انہیں پھر بھی کوئی لفظ نہیں مل سکا۔ اس قوم میں کسی بلند اخلاقی قدر کی خاطر جان دینے کا تصور ہی نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جس قوم کے ہاں، جان سے زیادہ گراں بہا متاع کوئی نہ ہو، اس کے نزدیک جان دینے کا جذبہ محرک کیا ہو سکتا ہے۔ یہ وجہ تھی کہ ہندوستانی سپاہیوں کو جب بھی میدانِ جنگ میں دیکھا، پیٹھ دکھا کر بھاگتے ہی دیکھا۔ وہ ان جوانانِ رعنا کے سامنے کیسے ٹھہر سکتے تھے جو موت کی ہنسی اڑاتے اور قضا کی ناک میں بیٹھے رہتے تھے۔ کس قدر صحیح کہا تھا امریکن میگزین (ٹائم) کے نامہ نگار نے کہ "جو قوم موت سے آنکھ مچولی کھیلنا جانتی ہو اسے دنیا کی کوئی فوج شکست نہیں دے سکتی"۔ اور کیسا برجستہ جواب دیا تھا ہمارے شگفتہ و شاداب، جنرل اوفیسر کمانڈنگ نے اسکے اس سوال کا کہ آپ لوگ ہندوستانیوں کے اس قدر کثیر التعداد ہونے کے باوجود، ان پر غالب کیسے آجاتے ہیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے جواب میں کہا تھا کہ ــــ اگر حوصلہ، جرأت اور جذبۂ جاں سپاری، دکانوں پر بکا کرتے، تو ہندوستان والے ان اجناس کو امریکی امداد میں حاصل کر لیتے؟ لیکن یہ متاعِ گراں بازاروں میں بکا نہیں کرتی۔ ان کی تخلیق، مردِ مومن کے قلب و جگر میں اس طرح ہوتی ہے جس طرح، آغوشِ صدف میں گوہرِ تاباں پرورش پاتا ہے۔ یہ پنہاں ہوتی ہے مردِ مسلمان کی نگہِ پاک میں، یہ مستور ہوتی ہے اس کے قلبِ بیباک میں۔ اس کے خونِ جگر کا ایک ایک قطرہ اس کا نشیمن، اور اس کے حیا پرور ماتھے کی ایک ایک شکن اس کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ یہ جذبے ابھرتے ہیں تلواروں کی جھنکار سے اور بپھرتے ہیں دشمن کی یلغار سے۔ جب یہ مردِ مجاہد کے سینے میں تلاطم خیز ہوتے ہیں تو دنیا کی کوئی قوت اس طوفانِ قیامت خیز کا مقابلہ نہیں کر سکتی ــ ہندو، نہ ان مقدس جذبات سے آشنا ہو سکتا ہے نہ ان کی پیدا کردہ قوتیں اس کے حیطۂ تصور میں آسکتی ہیں۔ سچ کہا تھا اقبالؒ نے کہ ؎

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اسکے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

یہی تھی وہ شرط جسے پورا کرنے کے بعد قرآن نے کہا تھا کہ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ - (۳/۱۳۸)۔ اگر تم ایمان کے ان جذبات کو اپنے اندر پیدا کر لو تو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں شکست نہیں دے سکتی۔ دنیا نے قرآن کے ان دعاوی کو صدیوں بعد، پاکستان کی سرحدوں پر

سچا ثابت ہوتے دیکھا، اور اس حقیقت کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کر لیا۔ کہ ؎

مثلِ کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی ! !
اب بھی درختِ طور سے آتی ہے بانگِ لَاتَخَف

اس معرکہ آرائی میں، ہمارے جیوش وعساکر نے اجتماعی طور پر جو کچھ کیا، اس کی تفاصیل ہم سب کو معلوم ہیں۔ اس لئے میں انہیں نہیں دہرانا چاہتا۔ لیکن ان میں جو کچھ ایک ایک فرد نے کیا تھا وہ اکثر ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے۔ میں اس وقت ان میں سے چند ایک واقعات آپ کے سامنے پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں، جن سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ اس قوم کا ــــ ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ ــــ عام طور پر کہا یہ جاتا ہے، کہ مشینی اسلحہ کی ایجاد سے انفرادی جرأت وبسالت کا دور ختم ہو گیا ہے۔ آپ ان حیات افروز اور سینہ تاب واقعات سے دیکھیں گے کہ وہ دور ختم نہیں ہوا۔ ہماری افواجِ قاہرہ میں ایسے لیے یگانۂ روزگار شیرانِ غاب چھپے بیٹھے ہیں جو وقت آنے پر وہ کچھ کر دکھاتے ہیں جس پر تاریخ صدیوں تک ناز کرتی رہے۔ آپ ان چند واقعات کو سنیئے اور پھر کہیئے قرطاسِ زمانہ سے کہ ان کی مثالیں کہیں اور سے لاکر دکھاتے۔

---

میں ابھی ابھی بتا چکا ہوں کہ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ اگر تم اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہو تو موت کی تمنا کر کے دکھاؤ ــــ میں سب سے پہلے اُن صادقین (سچوں) کی کہانی آپ کو سناتا ہوں جنہوں نے موت کی تمنا ہی نہیں کی اُسے خود آگے بڑھ کر گلے سے لگا لیا۔ اس

## میجر خادم حسین

سلسلہ میں میرے سامنے، محاذ کھیم کرن کے فاتح اول، میجر خادم حسین (ستارۂ جرأت) کا حسین وجمیل تصور آتا ہے۔ صورت یہ تھی کہ دشمن اپنی بے پناہ فوج اور سیلاب انگیز ٹینکوں کے ساتھ طوفانِ بلا کی طرح بڑھے چلا آرہا تھا۔ میجر خادم حسین کی ڈیوٹی فوج کو سامان بہم پہنچانے کی تھی، توپ وتفنگ سے نبرد آزما ہونے کی نہیں تھی۔ وہ ایک ٹرک میں سامان لادے جا رہا تھا کہ اُس نے دیکھا کہ ایک طرف سے دشمن کے ٹینک بڑھے چلے آرہے ہیں اور جس توپ نے انہیں روکنا تھا، وہ خاموش کھڑی ہے۔ اس نے دور سے نظر دوڑائی تو دیکھا کہ توپ تو صحیح وسالم ہے لیکن اس کا توپچی شہید ہو چکا ہے۔ میجر خادم حسین کو ایک ٹھنڈی سانس بھر کر، ایک طرف کو نکل جانا چاہیئے تھا۔ لیکن وہ بھارتی فوج کا میجر نہیں تھا، وہ اللہ کا سپاہی تھا۔ وہ کوندے کی طرح توپ کی طرف لپکا، مورچے میں کودا، اور دوسرے سیکنڈ میں اس خاموش توپ کے دہانے نے ایک آتشیں گولہ اگلا جس نے دشمن کے سب

سے اگلے ٹینک کی دھجیاں فضا میں بکھیر دیں۔ ابھی اس دھماکے کی صدائے بازگشت خاموش نہ ہونے پائی تھی کہ دوسرے گولے نے دشمن کے ایک اور ٹینک کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے لیکن اتنے میں تیسرا ٹینک خادم حسین کے مورچے کے اوپر آچکا تھا۔ یہ جانباز اس ٹینک سے کچلا گیا لیکن اس کے دو گولوں نے لڑائی کا رُخ موڑ دیا۔ بھارت کے باقی ٹینک دُم دبا کر بھاگ گئے۔ اگلے مورچوں کا انچارج، پلاٹون کمانڈر حیات، حیران تھا کہ یہ "معجزہ" کس فرشتے نے سرانجام دیا۔ وہ جب اس مورچے پر پہنچے تو انہیں کیفیت معلوم ہوئی، اور ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا کہ۔

اسلام کے شہید! خدا جانے تم کہاں سے آئے اور کیسے یہاں پہنچے۔
تمہاری جانثاری نے آج جنگ کا رُخ پلٹ دیا ہے۔
میجر خادم حسین کی شہادت، محاذ کھیم کرن کی پہلی فتح تھی ــــ ؎
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را!

---

یہ تو پھر بھی ایک میجر تھے جن کا احساس ذمہ داری نسبتاً گہرا ہوتا ہے۔ ہماری جانباز فوج کے جوانوں تک کے ایسے ایسے واقعات سامنے آتے ہیں، جن سے عقل ورطۂ حیرت میں گم ہو کر رہ جاتی ہے۔ فیلڈ ایمبولینس اور میڈیکل کور کے جوانوں کا

## ایک فوجی کمپاؤنڈر

کام لڑنا نہیں ہوتا، زخمیوں کو سنبھالنا ہوتا ہے۔ بلکہ ان کے لئے حکم ہوتا ہے کہ وہ لڑیں نہیں۔ لیکن عشق ان سلاسل کا پابند کہاں رہتا ہے۔ ایک دن کا ذکر ہے، بی۔ آر۔ بی کے کنارے گھمسان کا معرکہ تھا۔ نہر کے اُس پار ہمارے چند سپاہی رائفلیں سنبھالے، دشمن کی یلغار کو روک رہے تھے۔ نہر کے اِس کنارے ایمبولینس کور زخمیوں کو سنبھال رہی تھی کہ اتنے میں اس کور کے ایک جوان نے دیکھا کہ ہمارا ایک سپاہی شہید ہو گیا ہے۔ اور اس طرح حملہ روکنے والی دیوار میں شگاف پڑ گیا ہے۔ ایمبولینس کور کا یہ جوان اِدھر تھا، درمیان میں اس نہر کی تند و تیز لہریں حائل تھیں جنہیں دشمن سترہ دن کی یورشوں کے باوجود پار نہ کر سکا۔ ہم کیا دیکھتے ہیں، کہ ایمبولینس کور کے اس سپاہی نے نہر میں چھلانگ لگا دی۔ اور نہر کی موجوں سے کھیلتا ہوا دوسرے کنارے جا لگا۔ اپنے بازو پر لگے ہوئے ریڈ کراس کے نشان کو نوچ کر پھینک دیا۔ اور دوسرے ہی ثانیہ میں اُس شہید سپاہی کی رائفل سنبھالے، اس بنیانِ مرصوص کے شگاف کو پُر کرنے کے لئے مورچے میں جا پہنچا۔ یہ وہ معرکہ تھا جس میں بھارتی فوج کے میجر جنرل نرنجن پرشاد کو اپنی جیپ چھوڑ کر بھاگنا پڑا تھا۔ معرکہ سر ہونے کے بعد، جب پلٹن کے جانی نقصان کا جائزہ لیا گیا تو اس میں ایک نفری زیادہ تھی۔ اور

یہ اضافہ، ایمبولینس کور کے اسی جانباز نے کیا تھا جس نے اقبالؒ کے اس تخیل کو حقیقت بنا کر دکھایا تھا کہ ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق!
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

---

**ایڈوانس کرو!** اور یہ بھی اسی محاذ کا ذکر ہے کہ ہمارے سپاہی بڑھتے ہوئے آگے جا رہے تھے۔ ایک مقام پر پلٹن کے ایک نائک نے دیکھا کہ ہمارا ٹینک ہٹ ہو چکا ہے اور اس کا ڈرائیور زخموں سے چور چور اس کے سائے میں پڑا ہے۔ فیلڈ ایمبولینس کہیں دور تھی۔ یہ نائیک آگے بڑھا۔ دیکھا تو وہ سوار بیہوش پڑا ہے لیکن ہنوز سانس باقی ہے۔ اس نے جلدی سے اپنے جھولے سے پٹی نکالی۔ کہ اس کا خون پونچھے۔ اس کے منہ میں پانی ٹپکایا۔ اُس نے آنکھیں کھولیں اور پوچھا کہ تم کون ہو اور یہاں کیسے بیٹھے ہو۔ نائیک نے بتایا تو اس نے ڈوبتی ہوئی آواز سے کہا کہ گرائیں! مجھے چھوڑ دو۔ اور اپنی پلٹن کے ساتھ ایڈوانس کرو۔ وہ نائیک کہتا ہے کہ میں نے اس کی بات اَن سنی کر دی اور اس کے زخموں پر پٹی باندھتا رہا۔ تو اس نے دوبارہ آنکھ کھولی۔ نہ معلوم اس میں کہاں سے اتنا جوش آگیا کہ اُس نے گرج کر کہا کہ معلوم نہیں تم کس بے غیرت پلٹن کے نائک ہو۔ دشمن یلغار کر رہا ہے، تمہارے ساتھی آگے بڑھ رہے ہیں اور تم عورتوں کی طرح میرے سرہانے بیٹھے مرہم پٹی کر رہے ہو! دوست! اٹھو۔ لپک کر آگے بڑھو۔ میرے بچانے کی فکر نہ کرو۔ پاکستان کو بچانے کی فکر کرو۔ وہ بچ گیا تو سب کچھ بچ جائے گا۔ نائیک آگے بڑھ گیا۔ دشمن پسپا ہو گیا۔ واپسی پر دیکھا تو وہ زخمی شہید ہو چکا تھا۔ اس کی وردی خون میں لت پت تھی اور اس کی پیشانی پر ہنوز وہ شکنیں باقی تھیں جن سے اس نے اس نائیک کو ڈانٹ کر الگ کیا تھا۔ اور جن میں اس قوم کا مستقبل جھلمل جھلمل کر رہا تھا کس قدر جاذب نگاہ تھا اس شہید کا یہ انداز!

اک خونچکاں کفن میں ہزاروں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

---

**بے مثال ایثار** یہ تو وہ زخمی تھے جو میدانِ جنگ ہی میں شہید ہو گئے۔ لیکن جو ہسپتال میں پہنچائے گئے اُن کے جذبۂ ایثار کی داستانیں اُن سے بھی زیادہ تحیر انگیز ہیں۔ قرآن کریم نے مومنین کی ایک خصوصیت یہ بھی بتائی ہے کہ — یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ کَانَ

یُؤۡثِرُونَ عَلٰٓی اَنۡفُسِہِمۡ وَلَوۡ کَانَ بِہِمۡ خَصَاصَۃٌ ۔ (۵۹/۹)۔ وہ خود تنگی میں گزارہ کر لیتے ہیں لیکن دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں۔ دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دینے کی ایمان افروز کہانی' ایک فوجی ہسپتال کی نرس کی زبانی سنیے۔ اس نے کہا کہ ایک روز بیک وقت دو سٹریچر لائے گئے۔ میں نے اگلے سٹریچر کو اپریشن روم میں داخل کرنا چاہا، تو زخمی سپاہی نہایت نحیف سی آواز میں بولا کہ میری حالت اچھی ہے لیکن دوسرے زخمی کی حالت زیادہ مخدوش ہے۔ اسے پہلے دیکھ لو۔ چنانچہ اس دوسرے زخمی کو ٹیبل پر لٹایا گیا۔ اس کے زخم گو گہرے تھے لیکن تشویش انگیز نہیں تھے۔ نرس کہتی ہے کہ میں اس کی مرہم پٹی میں مصروف تھی کہ نرسنگ سپاہی نے آکر کہا کہ اس دوسرے زخمی کی حالت زیادہ خراب ہو رہی ہے۔ میں لپک کر ادھر گئی لیکن وہ اتنے میں ختم ہو چکا تھا۔

پوچھیے تاریخ کے اوراق سے' کہ جاں نثاری کی اس قسم کی مثالیں کہیں اور بھی مل سکتی ہیں؟

---

## سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

اور یہ واقعہ غالباً چونڈہ کے محاذ کا ہے کہ دشمن کو شکست دینے کے بعد جب اپنی فوج کے نقصانات کا جائزہ لیا گیا تو دیکھا کہ ایک ٹینک شکستہ حالت میں کھڑا ہے لیکن اس کے سوار کی لاش' ٹینک سے کوئی دو سو قدم آگے جا کر پڑی ہے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لاش' ٹینک سے آگے کس طرح چلی گئی۔ اس معمہ کو بھارتی فوج کے ایک قیدی نے حل کیا۔ اس نے کہا کہ جب اس ٹینک پر گولہ پڑا ہے تو ہم نے دیکھا کہ اس کا ڈرائیور لپک کر باہر آیا۔ اس کے کپڑوں میں آگ لگ رہی تھی اور اس کا چہرہ بری طرح جھلسا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سٹین گن تھی۔ وہ بجائے اس کے کہ اپنے آپ کو بچانے کے لئے پیچھے کی طرف جائے' سٹین گن سے فائر کرتا آگے کی طرف بڑھا۔ وہ اسی حالت میں فائر کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا آیا تا آنکہ وہ اس جگہ ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ اس نے اپنے آخری سانسوں میں بھی دشمن کے دس بیس سپاہی مار گرائے۔

اور اس ٹینک ڈرائیور کے حوصلے کی داد کون دے سکتا ہے جس کے ٹینک پر گولہ گرا تو وہ دوسرے کریو کے

### ٹینک بچا لیا

ساتھ نکل کر پیچھے آگیا۔ دشمن کی گولہ باری شدید تھی۔ اس نے پیچھے آکر دور سے اپنے جلتے ہوئے ٹینک کو دیکھا تو کہنے لگا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ٹینک کا انجن محفوظ ہے اسے بچا لینا چاہیئے۔ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھنے لگا تو ساتھیوں نے کہا کہ پاگل ہو گیا ہے؛ آگ کی اس بارش میں تو زندہ کیسے بچے گا؟ اس نے کہا کہ میں پاگل نہیں ہو گیا، میرے ہوش و حواس سب بجا ہیں۔ اگر میں مر گیا تو پاکستان کی دس کروڑ آبادی میں کوئی کمی نہیں واقع ہو جائے گی۔ لیکن اگر ہمارا ایک ٹینک ضائع ہو گیا تو اس سے ہمارا بہت

زیادہ نقصان ہوگا۔ پاکستان کے پاس ٹینکوں کی کمی ہے۔ یہ کہہ کر وہ آگ کے اس سمندر میں کود پڑا۔ اس کا اندازہ صحیح نکلا۔ ٹینک کا انجن درست حالت میں تھا۔ وہ جان پر کھیل کر ٹینک کو واپس لے آیا۔ اور اسکے انجن نے بڑا کام دیا۔

## گولہ انداز کی ہمّت

اور چونڈہ سیکٹر کے اس توپچی کو ہم کیسے فراموش کر سکتے ہیں کہ اس نے محسوس کیا کہ وقت کا تقاضا ہے کہ توپ سے گولے بڑی تیزی سے برسنے چاہئیں۔ لیکن ایک گولے کو ٹریکیٹر سے کریڈل میں ڈال کر لانے اور توپ میں لوڈ کرنے میں دو تین جوانوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور وقت بھی کافی لگ جاتا ہے۔ وہ ٹریکیٹر کے پاس جاتا، اڑھائی من کا گولہ اپنی پیٹھ پر لادتا، بھاگ کر توپ کے پاس آتا اور دوسرا توپچی اسے توپ میں دھکیل دیتا۔ جتنے میں یہ گولہ داغا جاتا اتنے میں وہ دوسرا گولہ پیٹھ پر لاد کر لے آتا۔ اس سے ایک توپ سے تین توپوں کا کام لیا جانے لگا۔ لیکن اڑھائی من کا گولہ اس تیزی کے ساتھ پیٹھ پر لاد کر لانا کچھ آسان کام نہیں تھا۔ ساتھیوں نے اسے بہت روکا لیکن وہ نہ رکا۔ اس نے کہا کہ اس وقت ایک ایک لمحہ قیمتی ہے، اسے ضائع نہیں کیا جا سکتا۔ وہ مسلسل تین روز تک گولے پیٹھ پر لاد کر لوڈ کرتا رہا۔ حتےٰ کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی کا ایک جوڑ ٹوٹ گیا اور کندھے کی بالائی ہڈی کوئی ایک انچ ابھر کر باہر آگئی۔ اس کے میجر نے اسے پیچھے چلے جانے کو کہا تو اس نے کہا کہ صاحب! یہ بڑی بے عزتی کی بات ہے کہ میں محض ہڈی ٹوٹ جانے سے ہسپتال چلا جاؤں۔ ڈاکٹر نے دیکھا تو کہا کہ وہ عمر بھر کے لئے معذور ہو چکا ہے لیکن حیرت ہے کہ وہ اچھا ہو گیا۔ اور اب گولے لادنے کے لئے دوسری جنگ کا انتظار کر رہا ہے۔

## میں سو کیوں گیا؟

آپ نے وقت کی اہمیت کا اندازہ لگانا ہو تو ہماری ٹینک رجمنٹ کے ایک دفعدار کی قلبی واردات سے لگائیے۔ بہتر ہو کہ اس کی یہ داستان آپ خود اس کی زبان سے سنیں۔ یہ دفعدار حافظِ قرآن بھی تھا۔ اس نے وقائع نگار کو بتایا کہ "سب سے پہلے جو ٹینک دشمن کے مقابلہ کو پہنچے وہ میرا ٹروپ تھا۔ میرا ٹینک سب سے آگے تھا۔ بیدیاں کے محاذ پر دشمن سے آمنا سامنا ہو گیا۔ میں اپنے ٹروپ کے ساتھ مسلسل پانچ روز تک اپنے ٹینک سے فائر کرتا رہا۔ ایک روز، جب شاید تین دن اور تین راتیں کھڑے کھڑے فائر کرتے گذر چکی تھیں، میری آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ میرا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ ہزار کوشش کے باوجود میں اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا۔ میرے ہاتھ میں

نے مجھے تھام لیا۔ اور گھبرا کر پوچھنے لگے کہ حافظ جی! کیا ہوا ہے؟ میں نے ان سے پوچھا کہ میں کتنی دیر سویا تھا؟ انہوں نے کہا کہ آپ سوئے کہاں تھے۔ آپ کو ذرا سی اونگھ آئی تھی۔ اس کے بعد آپ کے سر کو ذرا سا جھٹکا لگا۔ اور آپ بیدار ہو گئے۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ میری آنکھ ایک آدھ سیکنڈ تک ہی لگی تھی تو مجھے اطمینان ہوا اور میرا رعشہ تھمنے لگا۔ حافظ جی نے اپنی اس رعشہ کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہا کہ جب میری آنکھ کھلی تو یوں محسوس ہوا جیسے میں بہت دیر تک سویا رہا۔ مجھ پر کچھ عجیب سا خوف طاری ہو گیا۔ مجھے خیال آیا کہ کس قدر مقدس فرض کی ادائیگی میں میری آنکھ لگ گئی۔ اگر اس حالت میں میرا ٹینک ہٹ ہو جاتا تو میں حرام موت مر جاتا۔ اور اگلے جہان جب خدا مجھ سے پوچھتا کہ بدبخت بندے! جب کفار میرے قرآن اور مسجدوں کی سرزمین میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا تو اس وقت تمہیں نیند کیسے آگئی۔ تو میں کیا جواب دیتا؟ الحمدللہ کہ میں اس باز پرس سے بچ گیا۔ بس صاحب! اس کے بعد نہ بھوک محسوس ہوئی، نہ نیند آئی، نہ یہ ہوش رہا کہ دشمن کی فوج کتنی زیادہ ہے؟ میں تھا اور خدا کی طرف سے اس پرسش کا خیال۔ اس کے بعد بھلا نیند کیسے آجاتی!

---

بھوک اور پیاس کے احساس کے مٹ جانے کی بات تو خود مجھ سے محاذ کھیم کرن کی سب سے اگلی صف کے ایک صوبے دار نے بیان کی۔ فائر بندی کے بعد میں جنگ کے مختلف محاذوں پر گیا تھا تاکہ حق و باطل کی ان رزمگاہوں کو اپنی آنکھ سے دیکھ لوں[1]۔ میں جب کھیم کرن کی اس آخری سرحد پر پہنچا جہاں تک پہنچنے کے بعد ہم نے اپنے سپاہیوں کو آگے بڑھنے سے روک لیا تھا۔ تو ایک نوجوان صوبے دار نے اس معرکہ کی کیفیت مجھ سے بیان کی۔ وہ شروع سے آخر تک اس میں شریک رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ ۶ ستمبر کی صبح سے ۸ کی شام تک، مسلسل جنگ ہوتی رہی اور ہم آگے بڑھتے چلے گئے۔ تا آنکہ ہم یہاں تک پہنچ گئے۔ میں نے استعجاباً پوچھا کہ آپ تین دن اور تین راتیں مسلسل مصروفِ پیکار رہے تو اس میں کھانے پینے کا کیا انتظام تھا؟

اس نے حیرت بھری نظروں سے مجھے دیکھا، مسکرایا۔ اور کہا کہ صاحب! ہمیں تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کھانا پینا بے کار لوگوں کا مشغلہ ہے۔ میدانِ جنگ میں تو کبھی اس طرف دھیان بھی نہیں جاتا۔ چنے کی پوٹلی میرے پاس تھی۔ لیکن تین دن تک اس کی طرف نگاہ تک اٹھا کر نہ گئی۔

## یہ بیکاروں کا مشغلہ ہے

---

[1] ان مناظر کی کیفیات، طلوع اسلام میں مسلسل شائع ہوتی رہیں۔ عنوان تھا۔
"پاکستان کی نئی زیارت گاہیں"

آج تک جب میرے کانوں میں اس کی بات گونجتی ہے کہ صاحب! کھانا پینا تو کچھ بے کار لوگوں کا مشغلہ نظر آتا ہے، تو مجھے اپنے سوال پر خود ہی شرم آنے لگتی ہے۔ سچ ہے۔ کام کرنے والوں کی باتیں ہم بیکار لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ ؎

سرِ دیں ما را خبر، او را نظر  او درونِ خانہ، ما بیرونِ در
صبح و شامِ ما بہ فکرِ سازو برگ  آخرِ ما چیست؟ تلخیہائے مرگ
کارِ ما وابستۂ تخمین و ظن!
او ہمہ کردار و کم گوید سخن!

ضمناً یاد آگیا۔ ہم وہاں سے شام کے قریب لوٹے تو راستے میں، کچھ سپاہی، ایک اجڑے ہوئے کھیت کے کنارے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ علیک سلیک کے بعد انہوں نے ہم سے کہا کہ آیئے! کھانے میں شریک ہو جایئے۔ ہم نے معذرت چاہی اور کہا کہ گاڑی ہمارے پاس ہے، ہم کھلنے کے وقت گھر جا پہنچیں گے۔ آپ بسم اللہ کیجئے۔ اس پر ایک سپاہی نے کہا کہ صاحب! آجایئے۔ یہ تو کچھ اچھا نہیں لگتا کہ ایک بھائی کھا رہا ہو اور دوسرا پاس کھڑا دیکھ رہا ہو۔ اس نے تو یہ الفاظ نہایت سادگی سے کہہ دیئے لیکن ـــــ پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات ـــــ میں جب اس واقعہ کو یاد کرتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ جو بات اس اَن پڑھ سپاہی نے سادگی میں کہہ دی تھی، وہ اگر ہمارے اربابِ دانش و بینش کی سمجھ میں آجائے تو اس معاشرہ کا نقشہ کیا سے کیا نہ ہو جائے۔ یعنی یہ بات کہ:

"یہ تو کچھ اچھا نہیں لگتا کہ ایک بھائی کھا رہا ہو اور دوسرا بھائی پاس کھڑا دیکھ رہا ہو!"

اُف! کتنی پتے کی بات کہہ گیا وہ اَن پڑھ سا سپاہی! حقیقت یہ ہے کہ پتے کی باتیں یہی لوگ کر سکتے ہیں کیونکہ وہ بات بنا کر نہیں کہتے۔

---

**میں اسے لے لونگا** لیکن میں کہاں سے کہاں نکل گیا۔ ڈرتا ہوں کہ ان راستوں کے پیچ و خم میں کھو کر میں کہیں اس جانباز کی داستانِ سرفروشی بیان کرنا بھول ہی نہ جاؤں جس نے اقدار (VALUES) کے تقابل سے یہ راز سمجھا دیا کہ بڑی قدر کی خاطر، چھوٹی قدر کو کس طرح قربان کر دیا جاتا ہے۔

ہمارے (فارسی زبان کے) ایک شاعر نے کہا ہے کہ ؎

تہنیت گوئید مستاں را کہ سنگِ محتسب
بر سرِ ما آمد و از جانبِ صہبا گذشت

وہ کہتا ہے کہ میں شراب کی صراحی لئے بیٹھا تھا کہ اتنے میں شہر کا کوتوال اچانک آگیا۔ اس نے صراحی کو تان کر ایک پتھر مارا۔ لیکن ــــ اے میگسارو! تمہیں مبارک ہو کہ وہ پتھر میرے سر پر آکر لگا اور صراحی بچ گئی۔

ہمارے اس شاعر نے تو محض شاعری کی ہے۔ ان میں یہ ہمت کہاں کہ پتھر کو اپنے سر پر لے لیں۔ ان کی کیفیت تو، اقبالؒ کے الفاظ میں یہ ہے کہ ؎

از نزاکت ہائے طبعِ موشگافِ او مپرس
کز دمِ باد ے زجاجِ شاعرِ ما بشکند
کے تواند گفت شرحِ کارزارِ زندگی
"می پرد رنگش حبابے گر بدریا بشکند"

لیکن اس شاعری کو حقیقت بنا کر دکھا دیا ہمارے ایک ایسے مستِ بادۂ سرفروشی نے جسکا نام تک بھی کسی کو معلوم نہیں ہو سکا۔ بات بڑی اونچی ہے اس لئے اتنی ہی گہرائی سے سننے اور دل میں اتارنے کے قابل! یہ بات سنائی ہے ٹینک رجمنٹ کے ایک لانس نائک نے[1] اس نے کہا کہ لڑائی کا تیسرا دن تھا۔ معرکہ ایسا گھمسان کا کہ قریب قریب جنگ دست بدست تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ میرا ٹینک ہٹ ہو گیا تو میں نے ایک مشین گن سنبھال لی۔ لیکن دشمن اتنا قریب تھا کہ اس نے ہینڈ گرنیڈ پھینکنے شروع کر دیئے۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ اپنی فوج کا ایک سپاہی میرے قریب آکر لیٹ گیا اور کہنے لگا کہ وقت بہت نازک ہے۔ دشمن کے ہینڈ گرنیڈ تمہارے قریب آکر پھٹ رہے ہیں۔ تم اپنا کام کرتے جاؤ۔ اگر کوئی گرنیڈ تمہارے بالکل قریب آگرا تو اسے میں لے لوں گا۔ لانس نائیک نے بتایا کہ میں سمجھ گیا کہ اس نے جو کہا ہے کہ "گرنیڈ کو میں لے لوں گا" اس سے اسکا مطلب کیا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ تم پاگل ہو رہے ہو، تم اپنی جان بچاؤ۔ میری فکر نہ کرو۔ اس نے کہا کہ گرائیں! بات میری اور تمہاری حفاظت کی نہیں۔ میرے پاس صرف رائفل ہے، تمہارے پاس مشین گن ہے۔ اس وقت زیادہ ضرورت مشین گن کی ہے۔ میں مارا گیا تو صرف ایک رائفل خاموش ہو گی اور اگر تم مارے گئے تو مشین گن بیکار

---

[1] یہ واقعہ طلوع اسلام کی اشاعت بابت ستمبر ۱۹۶۷ء میں نقل ہو چکا ہے۔ لیکن یہ اس قابل ہے کہ اسے بار بار دہرایا جائے۔

ہو کر رہ جائے گی۔ اس لئے .. .. ..

وہ اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ ایک گرنیڈ میرے قریب آکر گرا۔ وہ سپاہی بجلی کی طرح کودا اور دھڑام سے گرنیڈ کے اوپر جا گرا۔ اس کے گرتے ہی گرنیڈ پھٹا اور اس کے ساتھ ہی اس کی بوٹیاں فضا میں اڑ گئیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ اِدھر یہ ہوا اور اُدھر ہمارے سپاہیوں نے دشمن کا منہ پھیر دیا۔ اس لئے اس کے بعد کوئی اور گرنیڈ ادھر نہ آیا۔

وہ لانس نائیک یہ واقعہ سنا رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ اس نے کہا کہ مجھے نہ اس جان نثار کا نام معلوم ہے، نہ اس کی پلٹن کا کوئی اتا پتہ۔ اگر مجھے کم از کم اس کے گاؤں ہی کا پتہ مل جاتا تو میں اس کی ماں کے پاس جاتا۔ اس کے قدموں پر سر رکھ کر اسے مبارک باد دیتا اور اُسے کہتا کہ:

دھن باد ہیں ایسی مائیں جو اس قسم کے سپوت جنتی ہیں!

پوچھئے نہ میں کرار سے کہ اسے اس کے سوال کا جواب مل گیا ہے یا نہیں کہ اس قدر قلیل التعداد اور بے سروسامان ہونے کے باوجود، پاکستانیوں نے بھارتی فوج کے چھکے کیسے چھڑا دیئے تھے۔

## ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز!

یہی سوال جب میں نے چونڈہ کے محاذ کے ایک کرنیل سے کیا تو اس نے کہا کہ ہم نے جب ساری (SITUATION) کا جائزہ لیا تو ہماری سمجھ میں ایک ہی بات آئی کہ ہم لڑائی کی بساط کا نقشہ بدل دیں۔ عام حالات میں یہ نقشہ یوں مرتب ہوتا ہے کہ سب سے آگے سپاہی ہوتا ہے اور اس کے بعد جوں جوں افسروں کا (RANK) بڑھتا جاتا ہے، ان کا مقام پیچھے ہوتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ جرنیل سب سے پیچھے ہوتا ہے۔ ہم نے نقشہ یوں بدلا کہ ہمارے جرنیل، بریگیڈیئر کرنیل، وغیرہ، اگلے مورچوں میں سپاہیوں کے ساتھ تھے۔ اس طرح، محمود و ایاز کے ایک صف میں کھڑے ہو جانے کا جو نتیجہ نکلا وہ ہماری عقل و فکر سے بھی باہر تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ لڑائی کا یہ وہ نقشہ تھا جو رسول اللہ مرتب فرمایا کرتے تھے۔ حضورؐ سپاہیوں کے ساتھ دوش بدوش کھڑے ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ اگر کبھی میدان میں بھگدڑ بھی مچتی تھی تو آپؐ اپنے مقام سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ روشنی کے مینار کی طرح جم کر کھڑے رہتے تھے۔ اور اس سے سپاہی پھر اپنے اپنے مقامات پر واپس آجاتے تھے۔ جنگ احزاب میں کچھ ایسا ہی ہوا تھا جس کا ذکر کرنے کے بعد قرآن کریم نے کہا تھا کہ۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ (۳۳/۲۱) تمہارے

لئے رسول اللہ کی یہ روش بہترین ماڈل تھی۔ آپ نے اس اسوۂ حسنہ کا اتباع کیا جس سے ایسے خیر العقول نتائج برآمد ہو گئے۔

میں یہ کہہ رہا تھا اور اس کرنیل اور اس کے ساتھی سپاہیوں کی آنکھیں نم آلود ہو رہی تھیں۔ یہ آنسو، مسرت کے تھے کہ انہیں اتباع حضور رسالتمآبؐ کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔

---

لیکن اُسوۂ حضور رسالتمآبؐ کا اس طرح کا اتباع، چونڈہ کے محاذ تک ہی محدود نہیں تھا۔ قریب قریب ہر مقام پر اس کے مظاہرے ہوتے رہے تھے۔ میں یہ کہہ رہا ہوں اور اس قسم کی بیسیوں مثالیں میرے افقِ ذہن پر اُبھرتی چلی آ رہی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں ان سے صرف اس ایک جوانِ رعنا کی مثال پر اکتفا کیوں نہ کروں، جس پر تاریخ ابدالاباد تک ناز کرتی رہے گی اور جس کا نام سننے کے لئے (میں سمجھتا ہوں کہ) آپ بھی بڑی بیتابی سے منتظر ہیں۔ یعنی فخرِ ملتِ اسلامیہ، شہید عزیز، میجر عزیز بھٹی! ؎

**شہید عزیز**

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا!!
کہ بوسے لطق نے بڑھکر مری زباں کے لئے

اس شہید عزیز نے جرأت و بسالت کے جو کارنامے سرانجام دیئے تھے، آپ میں کون ہو گا جو اُن سے بے خبر ہو۔ لیکن میں انہیں دہرانا نہیں چاہتا۔ میں اِس وقت، صرف اس نکتہ کی وضاحت کے لئے دو مثالیں پیش کرنا چاہتا ہوں، کہ اس جنگ میں افسروں نے کس طرح سپاہیوں کو اپنے آپ پر ترجیح دی۔

بھگی کے محاذ پر، نہر کے اُس پار، مسلسل پانچ دن اور پانچ راتیں، دشمن کا مقابلہ کرنے اور اسے شکست پر شکست دینے کے بعد، جب فیصلہ کیا گیا کہ انہیں اب نہر سے پیچھے ہٹ آنا چاہیئے تو نہر کے کنارے ایک شکستہ سی کشتی تھی۔ میجر عزیز اپنے سپاہیوں کو بحفاظت پیچھے بھی لا رہے تھے اور ساتھ کے ساتھ دشمن پر فائر بھی کرتے چلے جاتے تھے۔ کشتی کے قریب پہنچکر انہوں نے سپاہیوں سے کہا کہ جلدی جلدی کشتی میں سوار ہو کر نہر عبور کر جاؤ۔ سپاہی متامل تھے کہ میجر صاحب پہلے سوار ہو لیں تو ہم سوار ہوں۔ لیکن انہوں نے حکم دیا کہ سب سپاہی کشتی میں سوار ہو جائیں۔ سپاہی کشتی میں سوار ہوتے رہے اور میجر عزیز دشمن کی گولیوں کی بوچھاڑ میں، نہر کی پٹڑی پر کھڑے اپنے سپاہیوں کی حفاظت کرتے رہے۔ اس کشتی میں جو سب سے آخر میں سوار ہوا وہ ان سپاہیوں کا افسر میجر عزیز بھٹی تھا۔ کچھ وقت کے بعد، میجر بھٹی

کے کان میں نہر کے اُس پار سے ایک زخمی سپاہی کی آواز آئی جو افراتفری میں اُدھر رہ گیا تھا۔ آواز سن کر میجر عزیز تڑپ اٹھے اور اسے پکار کر کہا کہ

"مسکین علی! میرے بچے، فکر نہ کرو، میں پہنچا!

یہ دس ستمبر کا واقعہ ہے۔ گیارہ ستمبر کا پورا دن میجر بھٹی مسکین علی کو واپس لانے کے لئے مضطرب و بیقرار رہے۔ لیکن دشمن نے کوئی پیش نہ جانے دی۔ اور بارہ کی صبح انہوں نے اسی مقام پر جان دے دی جہاں سے مسکین علی کو پکار کر کہا تھا کہ "میرے بچے۔ فکر نہ کرو۔ میں پہنچا" غالباً وہ مسکین علی کو ساتھ لئے جنت میں پہنچے ہونگے۔

اور دوسری مثال اس سے بھی زیادہ درخشندہ و تاباں۔ لیکن اس تک پہنچنے سے پہلے تاریخ کے صفحات چودہ سو سال پیچھے الٹیئے اور سرزمین عراق میں پہنچ جایئے۔ جسے حضرت ابوعبیدہؓ نے ابھی ابھی فتح کیا تھا۔ وہاں کے سرداروں نے مسلمانوں کے لشکر کی دعوت کی۔ اس دعوت میں حضرت ابوعبیدہ رضؓ کے سامنے انواع و اقسام کے کھانے چُنے گئے۔ تو آپ نے میزبانوں سے پوچھا کہ کیا لشکر کے سپاہیوں کو بھی یہی کچھ دعوت میں دیا گیا ہے؟ جب جواب نفی میں ملا تو آپ نے یہ کہہ کر کھانے سے انکار کر دیا کہ ہمارے ہاں سپاہی اور سپہ سالار میں کوئی تمیز نہیں کی جاتی جب تک لشکر کو بھی وہی کچھ نہیں دیا جائے گا جو سپہ سالار کے سامنے پیش کیا گیا ہے، میں کھانے کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ چنانچہ آپ نے اس وقت کھانا کھایا جب اطمینان ہو گیا کہ تمام سپاہ کو وہی کچھ کھانے کو دیا گیا ہے۔

اور اب آجایئے برکی کے میدان میں جہاں تین دن اور تین راتیں میجر عزیز بغیر کچھ کھائے اور آنکھ جھپکے، مسلسل دشمن کے مقابلہ میں ڈٹے کھڑے رہے تھے۔ ان کے کوارٹر ماسٹر اکرام کا بیان ہے کہ جب میں نے دیکھا کہ جو روٹی میں ان کے تھیلے میں ڈال آتا ہوں وہ وہیں پڑی سوکھتی رہتی ہے تو مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ میجر عزیز کو میٹھی پوریاں بہت پسند تھیں۔ میں نے نہایت لذیذ پوریاں تیار کرائیں اور انہیں لے کر میجر عزیز کے پاس پہنچ گیا۔ وہ پوریاں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ کھڑے کھڑے ایک پوری اٹھائی۔ اس میں سے ایک لقمہ لیا۔ تو پوچھا کہ کیا سارے جوانوں میں اسی قسم کی پوریاں تقسیم کی گئی ہیں؟ میں نے کہا کہ آج تو اس کا انتظام نہیں ہو سکا، کل ان سب کے لئے انہیں تیار کرا دیا جائے گا۔ میجر عزیز نے یہ سنا تو باقی پوری جو ہاتھ میں تھی، مجھے واپس دے دی اور کہا کہ کل جب سارے جوانوں کو پوریاں مل جائیں گی تو اس کے بعد میں کھاؤں گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ میں پوریاں کھاؤں اور جوانوں کو سوکھی روٹیوں پر گذارہ کرنا پڑے۔ اور انہوں نے پوریاں سب جوانوں کے ساتھ دوسرے ہی دن کھائیں۔

احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ان کے اردلی اقبال کا بیان ہے کہ ایک رات، ہم سب کے اصرار پر وہ تھوڑی دیر آرام کرنے پر راضی ہو گئے۔ وہ اُس وقت ایک بالا خانہ کی چھت پر ڈیوٹی دے رہے تھے۔ میں نے کہا کہ نیچے کمرے میں بہت سے لوگوں کے بستر رکھے ہوتے ہیں۔ میں ایک بستر لئے آتا ہوں۔ اس پر آرام کیجئے گا۔ کہنے لگے کہ بالکل نہیں۔ لوگوں کی یہ تمام چیزیں جنہیں وہ چھوڑ کر گئے ہیں، ہماری امانت میں ہیں۔ ہم پر ان کا استعمال کرنا حرام ہے۔ یہ کہا اور وہیں چھت پر لیٹ گئے۔

آپ نے غور کیا کہ مسلمان مجاہد کا کیریکٹر کیا ہوتا ہے؟

---

عزیزانِ من! مجھے افسوس ہے کہ وقت بڑی تیزی سے بھاگے جا رہا ہے ورنہ ان داستانوں کو، جن کے تذکرہ سے ہمارے عروقِ مردہ میں تازہ خونِ زندگی دوڑ جاتا ہے، ختم کرنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ نہ ہی یہ ایسے ختم ہی ہو سکتی ہیں۔ یہ سارے حیرت انگیز کارنامے درحقیقت اسی محاورے کے جیتے جاگتے مظاہر ہیں جسے میں نے شروع میں بیان کیا تھا۔ یعنی مال صدقہ جان، جان صدقہ آبرو۔ یہ سب

## غیرت کے کرشمے

"آبرو" کی حفاظت کے کرشمے تھے۔ جس کے سامنے، ایک عبدِ مسلم کے نزدیک، جان کی قیمت ہی کچھ نہیں رہتی۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے "آبرو" سے مراد صرف حفاظتِ عصمت نہیں۔ اس میں وطن کی آبرو، قوم کی آبرو، اسلام کی آبرو، سب کچھ آ جاتا ہے۔ آبرو درحقیقت مستقل اقدار کی ترجمان ہوتی ہے۔ اسی کے تحفظ کا دوسرا نام غیرت ہے۔ اور جس قوم میں غیرت نہیں رہتی، وہ دنیا میں سب سے زیادہ بزدل، اور دوں ہمت ہوتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے بانگِ درا کی ایک نظم میں کہا ہے کہ جب غلام قادر روہیلے نے، دلی کو تاخت و تاراج کر کے، شاہنشاہ کی آنکھیں نکال دیں تو محلاتِ شاہی میں جا کر، شہزادیوں اور بیگمات سے پہلے رقص کرایا۔ پھر اس نے اپنی کمر سے تلوار کھولی اور اسے کھونٹی پر لٹکا دیا۔ اور خود پلنگ پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اٹھا اور ان مغلیہ شہزادیوں سے کہنے لگا کہ میں سویا نہیں تھا۔ جو ڈراما میں نے کھیلا تھا ؎

یہ مقصد تھا مرا اس سے کوئی تیمور کی بیٹی
مجھے غافل سمجھ کر مار ڈالے میرے خنجر سے
مگر یہ راز آخر کھل گیا شاہِ زمانے پر
حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے

تیمور کے گھر سے جب حمیت گئی تو اس کے ساتھ ہی سلطنت کے چراغ بھی گُل ہو گئے۔ لیکن گزشتہ جہاد پاکستان میں ہماری بیٹیوں اور بہنوں نے غیرت و حمیت کو جس انداز سے ابھارا، اس سے یہ حقیقت نمایاں طور پر سامنے آگئی کہ ہماری خاکستر میں ابھی ایسی چنگاریاں دبی ہوئی موجود ہیں جو وقت آنے پر شعلۂ جوالہ بن سکتی ہیں۔ میدانِ جنگ میں ایک سپاہی کے ہاتھ کو دیکھا گیا۔ تو اس میں تازہ مہندی رچی ہوئی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی ابھی ابھی شادی ہوئی ہے۔ دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ میری شادی میں دو دن باقی تھے کہ جنگ میں جانے کے لئے بلاوا آگیا۔ میں رخصت ہونے لگا تو میری ماں اور بہن نے، شگن پورا کرنے کے لئے میرے ہاتھ میں مہندی لگا دی۔ میری منگیتر، اپنے ہی گھرانے کی لڑکی تھی۔ وہ خاموشی سے قدم اٹھائے میرے قریب آئی اور اپنی چھنگلی کے خون کے دو قطرے میری مہندی میں ٹپکا کر خاموشی سے واپس چلی گئی۔ جب میں گھر سے باہر نکلا تو کسی عورت کی آواز سنائی دی ــــ "پیچھے کی فکر نہ کرنا۔ یہ وقت کبھی کبھی آتا ہے" ــــ معلوم نہیں یہ آواز میری ماں کی تھی، بہن کی یا منگیتر کی، لیکن اس آواز میں کچھ ایسا جادو کا اثر تھا کہ پھر بازی جیت لینے یا سر دے دینے کے سوا، مجھے کسی اور بات کا ہوش ہی نہیں رہا۔

## ہاتھ کی مہندی

اور کھیم کرن کے محاذ کے اس واقعہ کو کون بھلا سکے گا کہ جب ایک پلٹن کے سپاہی ایک گاؤں کے قریب سے گزرے تو کچھ جوان لڑکیوں نے ان سپاہیوں پر اپنے دوپٹے پھینکے اور کہا کہ "ویرو! بھیناں دیاں ایہناں چُنیاں دی لج رکھنا"۔ (بھائیو! اپنی بہنوں کے ان دوپٹوں کی لاج رکھنا)۔ پلٹن کے حوالدار نے بتایا کہ معلوم نہیں ان دوپٹوں میں کیا تاثیر تھی کہ اس کے بعد ہمیں اس کا ہوش نہیں رہا کہ ہمارا مقابلہ ٹینکوں سے ہے یا توپوں سے یہ دوپٹے ہماری کمر سے بندھ رہے تھے اور ان بیٹیوں کے ننگے سر ہماری آنکھوں کے سامنے پھر رہے تھے۔ جب تک ہم نے ان دوپٹوں کو کھیم کرن سے آگے نہیں پہنچا دیا، ہم نے دم نہیں لیا۔ اس مہم میں میری پلٹن کے دو سپاہی شہید ہو گئے۔ جب میں ان کی لاشوں کے پاس گیا تو میں نے دیکھا کہ انہوں نے ان دوپٹوں کو اپنی ٹوپیوں کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔

## بہنوں کے دوپٹے

غیرت یہ کچھ کر کے دکھایا کرتی ہے۔ لیکن یہ غیرت انہی کے دل میں پیدا ہو سکتی ہے جو دنیا کی ہر عورت کا احترام اپنا جزوِ ایمان سمجھیں۔ ہمارے سجیلے نوجوانوں نے اس احترام کا ثبوت کس طرح سے دیا تھا، اس کی شہادت، بھارت کی پارلیمان کے در و دیوار دیں گے جس میں، وہاں کے وزیر دفاع

چوآن نے بھرے مجمع میں کھڑے ہو کر علی الاعلان کہا تھا کہ

اس سترہ روزہ جنگ میں، کوئی ایک ایسا واقعہ بھی ہمارے نوٹس میں نہیں آیا جس میں پاکستانی فوج کے کسی فرد نے ہماری کسی عورت کو میلی نگاہوں سے بھی دیکھا ہو۔

## ہمارے سر جھکتے ہیں

ہمارے قابلِ فخر نوجوانوں کی اسی پاکیزگیٔ نگاہ کا صدقہ تھا کہ ہم دنیا میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہو گئے

ہمیں دنیا میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل بنانے والو! تمہاری عظمت کردار اور بلندیٔ سیرت کے سامنے ہمارے سر جھکتے ہیں۔ ہمارے پاس اس سے بیش قیمت کوئی اور نذرانہ نہیں جسے ہم تمہاری یاد میں پیش کر سکیں۔ ہماری اس نذرِ محقر کو قبول کر لیجئے۔

لیکن اے ایک طرف اگر ہمارا سر، تشکر و عقیدت کے لئے جھکتا ہے تو دوسری طرف اس احساسِ ندامت سے جھکتا ہے کہ ہمارے اندر جو انقلاب جنگ کے سترہ دنوں میں پیدا ہوا تھا اور جس کا نتیجہ تھا کہ یہ قوم کچھ سے کچھ ہو گئی تھی، وہ جنگ ختم ہونے کے ساتھ ہی ختم ہو گیا اور ہم پھر سے وہی کچھ بن گئے جو اس سے پہلے تھے، بلکہ اس سے بھی بدتر۔ قیامت کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ اس سے جب مردے جاگیں گے تو پھر نہیں سوئیں گے لیکن یا تو ہم ہی عجیب قسم کے مردے واقع ہوئے ہیں اور یا جو قیامت ہم پر گزری تھی وہی کچھ نرم قسم کی تھی کہ ہم نے اس کے شور سے آنکھ کھولی لیکن اس کے بعد پھر لمبی تان کر سو گئے۔ معلوم کچھ ایسا ہی ہوتا ہے کہ ہمارے جگائے رکھنے کے لئے کچھ زیادہ شدید قسم کی قیامت کی ضرورت ہے۔ شاعر نے تو محض شاعری کی تھی جب کہا تھا کہ ؎

ذرا کھل کر پکار اے صُور! مجذوبانِ الفت کو
یہ دیوانے کہیں بیٹھے نہ رہ جائیں بیاباں میں

لیکن ہمارے باب میں یہ شاعری حقیقت بن گئی۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ہمارے لئے اُس قیامت کی ضرورت ہے جس کے متعلق سورۂ زمر میں کہا گیا ہے کہ — وَ نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ - یعنی اس میں پہلی دفعہ صور پھونکا جائے گا تو سب پر بے ہوشی طاری ہو جائے گی۔ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ - اس کے بعد جب دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو پھر یہ اٹھ کھڑے ہوں گے اور اس انقلابِ عظیم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ جس میں کیفیت

یہ ہوگی کہ ۔ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا ۔ (۳۹/۶۹) زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اُٹھے گی۔

اگر ہماری آنکھ کھلنے کی شرط یہی ہے تو پھر جتنی جلدی یہ دوسرا صور پھونک دیا جائے اتنا ہی اچھا ہے اسی میں ہماری زندگی کا راز مضمر ہے اور یہی فطرت کا پیامِ ازلی ہے کہ ؎

سیارا بزم بر ساحل کہ آنجا — نوائے زندگانی نرم خیز است

بدریا غلط و با موجش درآویز! — حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

اور اسکے ساتھ ہی ہمیں قرآن کی اس وعید کو بھی اپنے سامنے رکھنا چاہیئے کہ

اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّ يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا ۔ (۹/۳۹)

اگر تم جہاد کے لئے ہر وقت مستعد نہ رہے اور وقت آنے پر میدان میں نہ نکلے تو تم پر ایک الم انگیز تباہی آجائے گی اور تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے لیگی۔ اور تم خدا کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکو گے۔


طلوعِ اسلام کی کتابیں اور ماہنامہ طلوعِ اسلام

یہاں سے بھی مل سکتے ہیں

لائلپور: ۔ (۱) محمد احمد صاحب متعلم ایم اے ۔ گلی ۷ بلاک اے ۔ نزد پرانی غلہ منڈی ۔ ریل بازار

(۲) شریف سنز بک سیلرز ۔ کارخانہ بازار ۔ لائلپور

(۳) حافظ محمد یونس صاحب ۔ اے ۱۹ ۔ گلبرگ ۔ لائلپور

سرگودہا: ۔ حکیم محمد حسن نظامی ۔ نظامی دواخانہ بلاک ۱۶ ۔ گلی مچھلی والی ۔ سرگودہا ۔

میانوالی: ۔ صوفی عبدالرحمٰن صاحب ۔ جلد ساز چوک فتح خان ۔ ملک مظفر سٹریٹ ۔ میانوالی ۔

ملتان: ۔ دانشکدہ حسین آگاہی ۔

راولپنڈی: ۔ (۱) بک سنٹر ۔ لارنس روڈ

(۲) محترم میرزا احمد قریشی صاحب ۔ ۳۰۲ ۔ F ۔ بھابڑا خانہ ۔

(۳) ظفر بک سٹال ۔ گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سٹینڈ صدر ۔

(۴) گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سٹینڈ ۔ اسلام آباد ۔

(۵) بک سٹال ۔ چوک فوارہ ۔ راجہ بازار ۔

لیہ: ۔ نقل ہوٹل ۔ نزد ریلوے اسٹیشن ہر جمعہ کو بعد نماز عصر ۔

مردان: ۔ (۱) صادق کمیشن ایجنسی ۔ بکٹ گنج ۔

(۲) صدیقیہ انجینیرنگ ورکس ۔ بنک روڈ ۔

# عنقریب شائع ہونے والی کتابیں

## خدا اور سرمایہ دار

یوں تو روٹی کا مسئلہ انسان کے ساتھ اس وقت سے لگا ہوا ہے جب اس نے اس خطۂ ارض پر آنکھ کھولی لیکن ہمارے زمانے میں اس نے ایسی اہمیت حاصل کر لی ہے کہ اس عہد کو کہتے ہی عہدِ معیشت AGE OF ECONOMICS ہیں۔ چنانچہ اس وقت دنیا جن دو بلاکوں میں بٹی ہوئی ہے ان میں وجہ تفریق ہی معاشی نظام ہے۔ ہمارا دعوےٰ ہے کہ قرآن کریم انسانی زندگی کے تمام بنیادی مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔ اس لئے سوال یہ سامنے آتا ہے کہ قرآن کی رو سے اس اہم ترین مسئلہ کا حل کیا ہے۔ طلوع اسلام اس موضوع پر گذشتہ بیس برس سے اہم فکری تحقیقات پیش کرتا چلا آ رہا ہے۔ لیکن یہ اس کے ہزارہا صفحات میں بکھرے پڑے ہیں اور جب کوئی کہتا ہے کہ میں سمجھنا چاہتا ہوں کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے اور دیگر معاشی نظاموں سے اس کا تقابلی مطالعہ کرنا چاہتا ہوں تو ہم اسے کسی جامع کتاب کی نشان دہی نہیں کر سکتے۔ اس کتاب کی اشاعت سے یہ دقت رفع ہو جائے گی۔ کتاب ضخیم ہے اور اعلیٰ اور سستے دونوں ایڈیشنوں میں چھپ رہی ہے۔ بہت جلد سامنے آ جائیگی۔

## قرآنی قوانین

بیس برس سے چرچا بھی ہو رہا ہے اور تقاضا بھی کہ یہاں اسلامی قوانین رائج ہونے چاہئیں لیکن ہمارے ہاں کوئی کتاب ایسی نہیں جس میں ان قوانین کو مرتب شکل میں جمع کیا گیا ہو۔ زیر تذکرہ کتاب میں ان تمام احکام کو مرتب کر دیا گیا ہے جو قرآن کریم میں بطور قوانین دیئے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں، ان مستقل اقدار کو بھی مدون کر دیا گیا ہے جن کی روشنی میں امت، عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق خود جزئی قوانین مرتب کر سکتی ہے۔ یہ کتاب ملک کی ایک اہم بنیادی ضرورت کو پورا کر دے گی۔

## عربی خود سیکھئے (تازہ ایڈیشن)

یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ اس اثنار میں قارئین کی طرف سے بہت سے مشورے موصول ہوئے جن سے کتاب کی افادی حیثیت بہت بڑھ جاتی تھی۔ ان مشوروں کو پیش نظر رکھتے ہوئے کتاب کا جدید ایڈیشن مرتب کیا گیا ہے جس سے اس کی ہیئت ہی کچھ اور ہو گئی ہے۔ اس کی کتابت ہو چکی ہے اور بہت جلد چھپ کر قارئین کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کو پورا کر سکے گی۔

## معراج انسانیت

ہمارے ہاں کی کتب سیرت میں دو قسم کی کتابیں ملتی ہیں۔ یا تو وہ جن میں مخالفین اسلام کو ایسا مواد ملتا ہے جن سے انہیں حضور نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ پر (خاکم بدہن) حملے کرنے کی جرأت ہو جاتی ہے۔ اور یا ایسی کتابیں جن میں ایسے غلو سے کام لیا گیا ہے کہ حضورؐ کی سیرت ہم انسانوں کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) بن ہی نہیں سکتی۔ پرویز صاحب کی یہ معرکہ آرا تصنیف اس انداز کی پہلی کوشش تھی جس کی رو سے حضورؐ کی سیرت مقدسہ کو اس طرح مرتب کیا گیا تھا کہ تمام واقعات اصولی طور پر قرآن کریم سے لئے گئے اور کتب روایات و سیر سے ان کی تائید حاصل کی گئی۔ اس طرح حضورؐ کی عظمت کردار اور رفعت سیرت اس طرح اجاگر ہو کر سامنے آئی کہ اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ یہ کتاب مدت سے نایاب تھی اور چونکہ بڑی ضخیم تھی اس لئے اس کے طبع ثانی کی نوبت نہیں آتی تھی۔ اس اثنار میں مصنف نے اس پر اس انداز سے نظر ثانی کی ہے کہ کتاب کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ بحمدہٖ تعالیٰ اس کی کتابت مکمل ہو گئی ہے۔ اور سمٹانے کے باوجود بڑی تقطیع کے پانچصد صفحات سے زیادہ پھیل گئی ہے۔ پرویز صاحب اکثر کہا کرتے ہیں کہ یہ کتاب میرے عشق کا ماحصل ہے اور اسے میں نے روشنائی کے بجائے اپنے خون جگر سے لکھا ہے۔ اس کی طباعت کا مرحلہ ہمت طلب ہے۔ لیکن ہم کوشش کریں گے کہ اس کے طے کرنے میں کم از کم وقت لگے۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام


یہ دونوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں

۱- جہاد ۲- پاکستان کا معمار اوّل

تفصیل ٹائٹل کے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے

پرویز صاحب کی ریڈیائی تقریر

(دیہاتی پروگرام میں)

# کسی کا حق مار لینا

میرے عزیز بھائیو اور بہنو! سلام و رحمت۔

میری آج کی بات چیت کا عنوان ہے ــــ کسی کا حق مار لینا ــــ یہ ایسا عنوان ہے جس کے تصور سے انسان کی روح کانپ اٹھتی ہے۔ جب آپ مانتے ہوں کہ فلاں چیز آپ کا حق نہیں، کسی دوسرے کا حق ہے، تو پھر اسکا حق مار لینا کتنا بڑا جرم ہے؟ خدا کا قانون تو بہت بڑی چیز ہے، یہ بات تو دنیا کے عام قاعدے اور قانون کے بھی خلاف ہے۔ حق کون مارتا ہے؟ وہی جو زبردست ہو جس کے پاس طاقت زیادہ ہو، اسکا جتھہ بڑا ہو۔ جسے قاعدے اور قانون کا کوئی لحاظ اور پاس نہ ہو۔ اسی کو دھاندلی کہتے ہیں۔ یہی ظلم کہلاتا ہے۔ ظالم اپنی دانست میں یہ سمجھتا ہے کہ میں کسی دوسرے پر ظلم کر رہا ہوں۔ لیکن قرآن شریف یہ کہتا ہے کہ ظالم کسی دوسرے پر ظلم نہیں کرتا، خود اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے اس لئے خدا کے قانونِ مکافات کیمطابق ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی۔ اس کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ اس نے دنیا کی بڑی بڑی قوموں کے حالات لکھے ہیں اور بتایا ہے کہ جس جس قوم نے ظلم اور زیادتی کی جس نے ایسا نظام بنایا جسمیں ہر ایک کو اسکا حق نہیں ملتا تھا وہ قوم تباہ اور برباد ہو گئی۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے تباہ ہونے سے بچا نہ سکی۔

یوں تو قرآن شریف نے ظلم کی کئی مثالیں بیان کی ہیں لیکن سورہ صٓ میں اس نے ایک ایسا واقعہ لکھا ہے جس سے ظلم کی وہ شکل سامنے آتی ہے جو ہمیشہ سے عام رہی ہو۔ اور آج بھی اس کی مثالیں ہر جگہ ملتی ہیں۔ اس میں لکھا ہے کہ دو آدمی حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس اپنا مقدمہ لیکر آئے۔ ان میں سے فریادی نے کہا کہ میری بات دھیان سے سن لیجئے اور میرے ساتھ انصاف کیجئے۔ یہ میرا بھائی ہے اسکے پاس ننانوے دُنبیاں ہیں اور مجھ غریب کے پاس صرف ایک دُنبی ہے۔ یہ کہتا ہے کہ تم اپنی ایک دُنبی بھی مجھے دے دو۔ اسکا یہ مطالبہ حق اور صداقت کے خلاف ہے لیکن چونکہ آدمی ہے زور والا، اس لئے مجھے بات ہی نہیں کرنے دیتا۔ دوسرے لوگ بھی اس سے ڈر کر اس کی طرفداری کرتے ہیں۔ مجھ غریب کی کوئی بات ہی نہیں سنتا۔

یہ ظلم اور زیادتی اور دوسرے کے حق مارنے کی ایسی کھلی ہوئی مثال تھی کہ اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر حضرت داؤد علیہ السلام سے کہا کہ داؤد! ہم نے تمہیں حکومت دی ہے تم عدالت کی کرسی پر بیٹھے ہو۔ اسلئے تم حق اور انصاف

کے ساتھ اسکا فیصلہ کرنا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اُس ظالم کو اپنے کمزور بھائی کی دُنبی لینے سے روک دیا لیکن اپنے فیصلے میں ایک ایسی بات لکھدی جو ہمیشہ کے لئے بطور اصول سامنے رکھی جا سکتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ بات صرف اسی آدمی کی نہیں۔ دنیا میں عام طور پر ہوتا ہی یہی ہے کہ جب کہیں اکٹھا کاروبار ہوتا ہے تو ننانوے دُنبیوں والا چاہتا یہی ہے کہ کمزور آدمی کی ایک دُنبی بھی اسکے پاس چلی جائے۔ آپ غور کیجئے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے کیسی پتے کی بات کہی ہے۔ دنیا میں ہوتا ہی یہی ہے۔ آج سے تین ہزار سال پہلے بھی یہی ہوتا تھا، آج بھی یہی ہوتا ہے اس سلسلہ میں آپ کو غالباً گاؤں کے اُس غریب، بھولے آدمی کا قصہ معلوم ہوگا جس نے سن رکھا تھا کہ روپیہ روپے کو کھینچتا ہے۔ اس نے محنت مزدوری کر کے کسی نہ کسی طرح ایک روپیہ جمع کیا اور اُسے لیکر شہر آگیا۔ ایک صرّاف کی دکان پر دیکھا کہ روپوں کا بڑا سا ڈھیر لگ رہا ہے۔ اُس نے دور سے اپنا روپیہ اُس ڈھیر میں پھینک دیا اور پھر الگ ہٹ کر دیکھنے لگا کہ کب روپوں کا وہ ڈھیر اس کی طرف آتا ہے۔ صرّاف نے جو اُسے اس طرح کھڑا دیکھا، تو پوچھا کہ کیا بات ہے۔ تم یہاں کیسے کھڑے ہو۔ اس نے کہا کہ میں نے سن رکھا تھا کہ روپیہ روپے کو کھینچتا ہے۔ میں نے اپنا روپیہ اس ڈھیر میں ڈالا تھا۔ اب انتظار میں ہوں کہ وہ ڈھیر کو کھینچ کر کب میرے پاس لاتا ہے۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ جس شخص نے مجھ سے یہ بات کہی تھی اس نے صحیح نہیں کہا تھا۔ صرّاف نے اس سے کہا کہ اُس شخص نے تم سے بالکل سچی بات کہی تھی۔ روپیہ روپے کو کھینچتا ہے۔ اِس ڈھیر نے تمہارے روپے کو کھینچ لیا۔ اب تم کیا انتظار کر رہے ہو؟

صرّاف نے بات بالکل ٹھیک کہی تھی۔ روپیہ روپے کو کھینچتا ضرور ہے لیکن تھوڑا روپیہ اُدھر کھنچکر چلا جاتا ہے جس طرف زیادہ روپیہ ہوتا ہے۔ یہی بات حضرت داؤد علیہ السلام نے کہی تھی کہ دنیا کا چلن ہی ایسا ہے، کہ ننانوے دُنبیوں والا غریب کی ایک دُنبی بھی اُس کے پاس نہیں رہنے دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں غریب، اور زیادہ غریب ہوتے چلے جاتے ہیں، اور امیر اور زیادہ امیر ہوتے جاتے ہیں۔ ایسا کچھ غریبوں کا حق مارنے سے ہوتا ہے یہی بات ہندی زبان کے ایک دوہے میں اسطرح کہی گئی ہے کہ

مایا کو مایا ملے کر کر لمبے ہاتھ!
تلسی داس غریب کی کوئی نہ پوچھے بات

یہ بات تو دنیا کے عام چلن کی ہے۔ لیکن ایک عدالت ایسی بھی ہے جہاں غریب کی بات پوچھی جاتی ہے اور وہ عدالت ہے قرآن شریف کی۔ اُس عدالت سے کسطرح غریب کے حق میں فیصلہ ہوتا ہے یہ بات غور سے سننے کی ہے۔

ایک آدمی دن رات محنت کرتا ہے لیکن اسکے باوجود اسے اتنا نہیں ملتا جس سے اس کا اور اس کے بال بچوں کا پیٹ پل سکے۔ اسے عربی زبان میں سائل کہتے ہیں۔ یعنی وہ جس کی ضروریات پوری نہ ہوتی ہوں۔

ایک آدمی کسی بیماری حادثے یا بڑھاپے کی وجہ سے ایسا معذور ہوگیا ہے کہ وہ محنت کرنے کے قابل ہی نہیں رہا۔ اسے عربی زبان میں محروم کہتے ہیں۔

دُنیا کے عام چلن میں سائل یا محروم کا کوئی حق نہیں سمجھا جاتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ انہیں خیر خیرات کے طور پر کچھ دے دیتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اگر لوگ انہیں خیرات کے طور پر کچھ نہ دیں تو نہ یہ نادار اور غریب اپنے حق کے طور پر ان سے کچھ مانگ سکیں گے، نہ ہی دنیا کی کوئی عدالت یہ کہے گی کہ انہوں نے اِن غریبوں، اور محتاجوں کا حق مار لیا ہے۔ لیکن قرآن شریف کی عدالت سے یہ فیصلہ صادر ہوتا ہے کہ سائل اور محروم کا امیروں کی دولت میں حق ہے اور حق بھی ایسا جس کا ہر ایک کو علم ہونا چاہیئے۔ اس لئے اگر امیر آدمی، ان محتاجوں کی ضروریات پوری نہیں کرتے، تو وہ ان کا حق مارتے ہیں۔ اور انہیں حق حاصل ہے کہ وہ اُن سے اپنا حق طلب کریں۔

اب آپ سوچئے کہ جو عدالت اس چیز کو بھی حق قرار دیتی ہے جسے عام دنیا خیرات کہتی ہے اور اگر کوئی محتاجوں کے اس حق کو پورا نہیں کرتا تو اُسے ظالم قرار دیتی ہے۔ وہ عدالت کبھی ایسا گوارا کر سکتی ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کا حق مار لے! خدا کی عدالت میں کسی کا حق مارنے سے زیادہ سنگین جرم کوئی نہیں۔ اس جرم کی سزا یہ ہے کہ ایسا کرنے والے کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ لوگ عام طور پر کہتے ہیں کہ ہم تو دیکھتے ہیں، کہ حق مارنے والے دن بدن پنپتے چلے جاتے ہیں اور جن کا حق مارا جاتا ہے ان کی داد فریاد کوئی نہیں سنتا۔ لیکن وہ اتنا نہیں سوچتے کہ جس طرح بیج بونے اور فصل پکنے میں ایک مدت درکار ہوتی ہے، اس سے پہلے فصل پک نہیں سکتی۔ اسی طرح عمل اور اس کے نتیجے کے سامنے آنے میں بھی ایک مہلت کا وقفہ ہوتا ہے۔ اس وقفے کے بعد وہ عمل اپنا نتیجہ سامنے لاکر رہتا ہے۔ جب خدا کی عدالت کا فیصلہ یہ ہے کہ ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی تو ایسا ضرور ہوکر رہتا ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ خدا کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں ہے۔ دنیا میں جس نے کسی کا حق مارا ہے وہ کبھی پنپ نہیں سکا۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے جسے نہ کوئی روک سکتا ہے، نہ بدل سکتا ہے جس نظام میں ننانوے دنیوں والا غریب کی ایک دُنبی پر بھی نظر رکھے اور جہاں ضرورتمندوں کی ضروریات ان کے حق کے طور پر پوری نہ ہوتی ہوں، وہ نظام کبھی باقی نہیں رہ سکتا۔ یہ اُس خدا کا فیصلہ ہے جس کے فیصلوں کو نہ کوئی موڑ سکتا ہے، نہ ٹال سکتا ہے۔

والسلام

# قائدِ اعظمؒ اور مودودی صاحب کے تعلقات

راست بازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے۔ اور جھوٹ اس کی نگاہ میں بدترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتوےٰ دیا گیا ہے۔

(سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۵۰ء)

میکیاولی سیاست کا مدار اس تکنیک پر ہے کہ جھوٹ بولتے، دھڑلے سے بولئے۔ لوگ اس کی تردید کریں تو ان کی کہی کو اَن سنی کر دیجئے اور خود جھوٹ بولتے چلے جائیے۔ ہمارے ہاں جماعت اسلامی نے بعینہٖ یہی مسلک اختیار کر رکھا ہے۔ ان کے پراپیگنڈے کا مدار ہی جھوٹ پر ہے۔ اس جماعت سے متعلقین یا متفقین میں بعض ایسے بھی تھے جن کے دل میں اس طرح جھوٹ بولنے سے کچھ خلش پیدا ہوتی تھی۔ ان کے لئے اس جماعت کے امیر کے مندرجہ بالا فتوےٰ نے نہ صرف یہ کہ اس خلش کے مٹانے کا سامان پیدا کر دیا بلکہ جھوٹ کو شرعی وجوب قرار دے کر اسے کارِ ثواب بنا دیا۔ اب انہیں جھوٹ بولنے میں کیا باک ہو سکتا ہے؟

جماعتِ اسلامی کے ان اکاذیب میں ایک یہ بھی تھا کہ مودودی صاحب نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت نہیں کی تھی۔ ان کے اس تابوت میں آخری میخ، صدر ایوب کی کتاب نے گاڑ دی جس میں واضح الفاظ میں مودودی صاحب کا کردار پیش کر کے، کہا گیا ہے کہ:

یہ پاکستان کے شدید ترین مخالف تھے!

اب ان لوگوں کی طرف سے یہ افسانہ مشہور کیا جا رہا ہے کہ قائدِ اعظمؒ کے مودودی صاحب کے ساتھ تعلقات بڑے گہرے تھے۔ اس سلسلہ میں، پاکستان ٹائمز (لاہور) کی ۱۳ اگست کی اشاعت میں

محترمہ مریم جمیلہ کا ایک خط شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ

قائداعظم کے مودودی صاحب کے ساتھ تعلقات نہایت گہرے اور دوستانہ (MOST CORDIAL AND FRIENDLY) تھے۔ کراچی کے ایک ہفت روزہ (اخبار) کی ۷ دسمبر ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں کہا گیا ہے کہ قائداعظم نے اس بات کی تردید کی تھی کہ جماعت اسلامی اور مسلم لیگ میں کسی قسم کی باہمی مخالفت ہے۔ قائداعظم نے کہا تھا کہ ان دونوں تحریکوں کا کام ایک دوسرے کی تائید اور تکمیل کرنا تھا۔

اس سلسلہ میں حسب ذیل امور قابل غور ہیں۔

(۱) محترمہ مریم جمیلہ صاحبہ یہودی الاصل، امریکن نژاد خاتون ہیں جو دو تین سال ادھر، امریکہ سے جماعت اسلامی کے ہاں تشریف لائی تھیں۔ اور (اس جماعت کی اطلاع کے مطابق) اسلام لا کر، جماعت کے ایک کارکن کے رشتۂ نکاح میں منسلک ہو گئی تھیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ محترمہ (تحریکِ پاکستان کے دوران) ہندوستان میں موجود ہی نہیں تھیں (شاید یہ اُس وقت ابھی پیدا بھی نہ ہوئی ہوں) اس لئے یہ ان کا ذاتی علم نہیں ہو سکتا کہ قائداعظم اور مودودی صاحب کے تعلقات کیسے تھے۔

(۲) محترمہ کے اس دعوے کی بنیاد "کراچی کے ایک ہفت روزہ" کی شہادت پر ہے جس کا انہوں نے نام تک بھی نہیں لکھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ہفت روزہ خود جماعتِ اسلامی ہی کا ترجمان ہو۔

(۳) قائداعظمؒ کی تقاریر اور بیانات کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں۔ ان کے سوانح حیات پر مشتمل کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ (جہاں تک ہمیں معلوم ہے) ان میں سے کسی ایک میں (باہمی تعلقات تو ایک طرف) مودودی صاحب کا نام تک بھی کہیں موجود نہیں۔ مودودی صاحب کی اُس زمانے میں اہمیت ہی کیا تھی جو قائداعظمؒ ان کا ذکر کرتے۔

(۴) پاکستان میں ابھی لاکھوں، کروڑوں نفوس ایسے موجود ہیں جو تحریکِ پاکستان کے زمانے میں ہندوستان میں تھے۔ اور ان میں ایسے بھی ہیں جنہوں نے اس تحریک میں عملاً حصہ لیا تھا۔ کیا ان میں ایک بھی ایسا نہیں جسے ان تعلقات کی بابت کچھ علم ہو؟

(۵) باقی باتوں کو چھوڑیئے، خود مودودی صاحب ابھی ہم میں موجود ہیں اور محترمہ جمیلہ صاحبہ کے قریب ہیں۔ کیا انہوں نے ان سے بھی دریافت کر لیا تھا کہ قائداعظم کے ساتھ ان کے تعلقات کیسے تھے۔ اور وہ کبھی قائداعظم سے ملے بھی تھے؟ اور کیا جماعتِ اسلامی کا بھی وہی مسلک تھا جو مسلم لیگ

کا تھا ؟

(۶) یہ ایک حقیقت ہے جس کی مودودی صاحب کی صدہا صفحات پر پھیلی ہوئی تحریریں شاہد ہیں کہ مودودی صاحب تحریکِ پاکستان کے شدید ترین مخالف اور مسلم لیگ کے بدترین ناقد تھے۔ اب آپ سوچئے کہ جو شخص تحریکِ پاکستان کا اس قدر مخالف ہو، کیا قائداعظم اس کے ساتھ دوستانہ تعلقات وابستہ کر سکتے تھے؟ قائداعظمؒ نے تو اس سلسلہ میں اپنے عمر بھر کے (سابقہ) ساتھیوں کو چھوڑ دیا تھا۔ تحریکِ پاکستان کی بنیاد اسلامی تقاضا پر تھی، اور اسلام کے ساتھ قائداعظم کی شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ (اور تو اور) جب ان کی اکلوتی بیٹی نے اسلامی شریعت کے خلاف ایک قدم اٹھایا ہے تو انہوں نے عمر بھر اس بیٹی کی شکل تک نہیں دیکھی۔ کیا ایسا شخص تحریکِ پاکستان کے مخالف کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرے گا؟

---

اس کے بعد آیئے خود مودودی صاحب کی طرف اور دیکھئے کہ قائداعظمؒ کے متعلق ان کے کیا خیالات تھے؟ ان کے یہ خیالات خود ان کی تحریروں میں موجود ہیں جن کے کچھ اقتباسات ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں :-

(۱) مسلم لیگ کی تحریکِ پاکستان پر تنقید کرتے ہوئے، مودودی صاحب نے (ترجمان القرآن۔ بابت ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ میں) لکھا تھا کہ اس کی قیادت ان لوگوں کے ہاتھ میں دیدی گئی ہے —

> جن کے خیالات، نظریات، اور طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی۔ ان کا یہ حال ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے مسائل سے لیکر بڑے سے بڑے مسائل تک کسی معاملہ میں بھی انہیں قرآن کا نقطۂ نظر نہ تو معلوم ہی ہے اور نہ ہی اسے تلاش کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ انہیں نورِ ہدایت مغربی قوانین و دساتیر ہی میں ملتا ہے۔

(۲) اسی پرچہ میں خود قائداعظمؒ کے متعلق تحریر تھا۔

> افسوس کہ لیگ کے قائداعظمؒ سے لیکر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو۔ اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے پرکھتا ہو۔

حتیٰ کہ انہوں نے، ان سے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ۔

> اپنی اس قوم پرستانہ تحریک کے لئے آپ کو اسلام کا نام استعمال کرنے کا حق

نہیں ہے۔ (ایضاً)

(۳) قائداعظمؒ کی مسلم لیگ اور جماعتِ اسلامی کے تقابل کے سلسلہ میں ارشاد تھا :۔

اس تنظیم میں جو لوگ سب سے آگے کی صف میں نظر آتے ہیں، اسلامی جماعت میں ان کا صحیح مقام سب سے پیچھے کی صف میں ہے۔ بلکہ بعض تو وہاں بھی برعایت ہی جگہ پا سکتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کو پیشوا بنانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے ریل کے سب سے پچھلے ڈبے کو انجن کی جگہ لگا دینا۔

(سیاسی کشمکش حصہ سوم مطبوعہ ترجمان القرآن۔ جلد ۱۷، عدد ۶۔ صفحہ ۴۷۸)

اور اس کی تشریح یہ کہہ کر کی گئی تھی کہ

اس موقعہ پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مسلم لیگ کے کسی ریزولیشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں کی کسی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمحِ نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے۔

(ترجمان القرآن۔ جلد ۱۷، عدد ۱، صفحہ ۲۷)

اس تحریک کے ماحصل کے متعلق یہ فتویٰ دیا گیا تھا کہ۔

جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلّط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومت الٰہی قائم ہو جائے گی تو ان کا یہ گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔ اس کا نام حکومتِ الٰہی رکھنا، اس پاک نام کو ذلیل کرنا ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۲۹)

(۴) مودودی صاحب دس سال تک متواتر اسی انداز سے لکھتے چلے گئے۔ وہ ان نیش زنیوں میں مصروف تھے اور ان کے رفقاء، قائداعظمؒ کی ذات کو استہزا اور استخفاف کا نشانہ بنانے میں مشغول۔ چنانچہ اس جماعت کے آرگن (کوثر) نے اپنی ۱۳ر جنوری ۱۹۴۷ء کی اشاعت میں قائداعظمؒ کا مذاق ان الفاظ میں اڑایا :۔

"ضرورت ہے ایک ہٹلر اور مسولینی کی"

اس زمانے میں ہٹلر نے جرمنی میں اور مسولینی نے اٹلی میں ظہور کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اپنی قوموں کو زمینِ پستی سے اٹھا کر آسمانِ رفعت پر بٹھا دیا۔ مسلمانوں نے

دوسروں کو اس طرح ترقی کرتے ہوتے دیکھا تو انہوں نے بھی اپنے اشتہار کی عبارت بدل ڈالی۔ اب اُن کے اخبارِ خیال کے صفحات پر یہ مضمون نظر افروز تھا۔

"ضرورت ہے ایک ہٹلر اور مسولینی کی"

۔۔۔ بالآخر اُن کی اشتہار بازی کامیاب ہوئی اور مسٹر جناح نے اپنی درخواستِ قیادت قوم کے حضور میں گزران دی۔ قوم نے باقی سب امیدوارانِ قیادت کو برخاست کر دیا اور مسٹر جناح کو اپنا لیڈر تسلیم کر لیا۔ اور قائداعظم زندہ باد کے نعروں سے فضائے ہند معمور ہو گئی۔ قائداعظمؒ نے بھی اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر دیا کہ مہدی علیہ السلام نہ سہی، مگر مانوی، موسولینی، ہٹلر اور مسولینی کی طرح تو وہ قوم کی خدمت کر ہی سکتے ہیں۔ (بحوالہ مولانا مودودی۔ دعاوی اور عمل ص۶)

واضح رہے کہ (کوثر) کے مدیر نصر اللہ خان عزیز تھے جو اب بھی جماعتِ اسلامی کے اہم عناصر میں سے ہیں۔ انہوں نے قائداعظمؒ پر ہٹلر اور مسولینی کی پھبتی خود اپنے امیر ہی سے مستعار لی تھی جنہوں نے مسلم لیگ کے راہ نماؤں کے متعلق لکھا تھا کہ

"..... یہ مسلمانوں کی قوم میں پیدا ہوتے، اس لئے مسلمانوں کی حکومت ان کا نصب العین بن گیا ہے۔ یہی ہندوؤں میں پیدا ہوتے تو موسولینی اور ساورکر بنتے۔ جرمنی میں پیدا ہوتے تو ہٹلر اور گوئرنگ کے روپ میں نمودار ہوتے۔ کسی اطالوی کی آغوشِ محبت میں جنم لیتے تو مسولینی کی صورت اختیار کرتے"

(ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ۔ صفحہ ۱۹)

(۵) مودودی صاحب، تحریکِ پاکستان کے آخری دم تک، قائداعظمؒ اور ان کی تحریک کے متعلق یہ کچھ کہتے رہے۔ اس کے باوجود جب وہ پاکستان بننے کے بعد، بھاگ کر یہاں آ گئے تو قائداعظمؒ کی کشادہ ظرفی تھی کہ انہوں نے اس پر کوئی مواخذہ نہ کیا، اور انہیں یہاں پناہ دے دی۔ لیکن مودودی صاحب کی طرف سے اس کا بدلہ کیا ملا، اسے بھی سن لیجئے۔ پاکستان میں ترجمان القرآن کا پہلا پرچہ جون ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ اس میں انہوں نے تحریکِ پاکستان اور اس کے قائدین کے خلاف اس قدر زہر اگلا کہ اسے پڑھنے سے آج بھی انسان کا خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ اس تحریک کے متعلق تفصیلی بحث کرنے کے بعد انہوں نے لکھا۔ کہ

یہ بحث ان لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے جنہوں نے پچھلی ربع صدی میں

ہماری سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی۔ (ص ۴۰)

اس کے بعد، اگست ۱۹۴۶ء کے ترجمان القرآن میں فرمایا :-

اس پورے گروہ میں ایک کوہ کن بھی نہ نکلا جو بازی کھو دینے کے بعد سر دے سکتا۔ ساری جماعت بازی گروں سے پٹی پڑی تھی جنہوں نے عجیب عجیب قلابازیاں کھا کر دنیا کو اپنی بودی سیرت اور کھوکھلے اخلاق کا تماشا دکھایا اور اس قوم کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی جس کے وہ نمائندے بنے ہوتے تھے۔ (ص ۴۰)

جب یہ پرچہ شائع ہوا ہے تو قائداعظمؒ کا دم واپسیں تھا۔ گویا یہ مودودی صاحب کے قائداعظمؒ کے ساتھ گہرے دوستانہ مراسم، کی آخری شہادت تھی جو ان کی زندگی میں ہم پہنچائی گئی۔

---

آپ نے غور فرمایا کہ مودودی صاحب کے قائداعظمؒ کے متعلق کیا خیالات تھے؛ اور اس کے بعد، محترمہ مریم جمیلہ صاحبہ کے اس دعوے پر بھی نگاہ ڈالیے کہ قائداعظمؒ کے مودودی صاحب کے ساتھ بڑے گہرے دوستانہ تعلقات تھے اور قائداعظمؒ مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کو ایک دوسرے کی مؤید اور معاون سمجھتے تھے۔

لیکن اس سلسلہ میں خود مودودی صاحب کا کردار بھی قابلِ مطالعہ ہے۔ ان کی جماعت سے متعلقین اخبارات میں اس قسم کے دعاوی شائع کر رہے ہیں، اور مودودی صاحب خاموش بیٹھے دیکھ رہے ہیں کہ اگر یہ جھوٹ چل گیا تو ھوالمراد، اور اگر کسی نے گرفت کر لی تو کہہ دیا جائے گا کہ میں دوسروں کی باتوں کا ذمہ دار تھوڑا ہوں!

چنیں دور آسماں کم دیدہ باشد

---

لیکن جماعت اسلامی کی یہ روش کچھ نئی نہیں۔ وہ اپنے جھولے میں ہمیشہ دونوں قسم کے سکے رکھتے ہیں کہ جس قسم کی مصلحت ہو اسی قسم کا سکہ نکال کر پیش کر دیا۔ مثلاً آپ نے دیکھا ہے کہ مودودی صاحب نے فرمایا تھا کہ :

افسوس کہ لیگ کے قائداعظمؒ سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو۔ اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نگاہ

سے پرکھتا ہو۔

اب اسی قائدِاعظم کے متعلق، جماعتِ اسلامی کے آرگن ۔۔۔ ایشیا ۔۔ کی ۱۳ اگست ۱۹۶۶ء کی اشاعت کے سرورق پر جلی الفاظ میں یہ عبارت درج ملتی ہے۔

## "میں مسلمانوں سے کبھی مایوس نہیں ہوا"

> میرے ہادی اور آقا ؐ کی تعلیمات میں مایوسی کا لفظ تک نہیں۔ زندہ قوموں کو انتہائی مصائب اور مشکلات میں بھی مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ مسلمان کو تو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جب وہ مصیبتوں، مشکلوں، طوفانوں، آندھیوں میں گھر جائے تو وہ غیراللہ سے رشتے توڑ کر اپنے خدا کی طرف رجوع کرے۔ کیونکہ وہی مصیبتوں کو راحتوں میں تبدیل کرنے پر قادر ہے۔
>
> (قائدِاعظم علیہ الرحمۃ)

ان لوگوں میں کوئی بھی ایسا نہیں جو اپنے امیر سے پوچھے کہ جس شخص (قائدِاعظمؒ) کے عقاید و تصورات یہ تھے، اس کے متعلق یہ کہنا کہ "وہ نہ اسلامی ذہنیت رکھتا ہے، نہ اسلامی فکر" کتنا بڑا اتہام تھا۔ واضح رہے کہ ایشیا کے مدیر وہی نصراللہ خاں صاحب عزیز ہیں جو کوثر کے مدیر تھے۔ اور قائدِاعظمؒ کا اس طرح مذاق اڑایا کرتے تھے جس کی ایک مثال ہم اوپر (کوثر کے اقتباس سے) درج کر چکے ہیں۔

اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھیئے۔ مودودی صاحب نے (تحریکِ پاکستان کے دوران) کہا تھا کہ

> مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں کی کسی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمحِ نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے۔

اب ایشیا کے محولہ بالا پرچہ میں، مودودی صاحب کی ایک تقریر شائع ہوئی ہے جس کے متعلق اس میں لکھا ہے کہ انہوں نے وہ تقریر آج سے انیس سال پہلے (یعنی تشکیلِ پاکستان کے فوری بعد) کی تھی اس تقریر میں انہوں نے کہا تھا:

> پچھلے دس سال میں بہ حیثیت قوم ہمارا مطالبہ یہ تھا کہ ہمیں ایک خطۂ زمین ایسا ملنا چاہیئے جس میں ہم اپنے تہذیب و تمدن کو ازسرِنو قائم کر سکیں۔ اور اپنے دین کے اصولوں پر اپنی زندگی کو نشوونما دے سکیں اور ایک غیرمسلم اکثریت کے تحت ہمارے لئے اس قسم کی زندگی ممکن نہیں ہے۔

ان سے کوئی اتنا نہیں پوچھتا کہ تحریکِ پاکستان کے دوران تو آپ کہتے تھے کہ یہ بات کسی نے نہیں کہی کہ نظریہ پاکستان سے مقصود اسلامی نظامِ حکومت کا قیام ہے۔ اور تشکیلِ پاکستان کے بعد آپ اعلان فرما رہے ہیں کہ وہاں مسلسل دس سال تک مسلمانوں کا یہ مطالبہ تھا کہ ہمیں ایک ایسا خطہ زمین ملنا چاہیئے جس میں اسلامی انداز کی حکومت قائم کی جاسکے، تو اس تضاد بیانی کا جواز کیا ہے؟

یہ ہے "صالحین" کے ٹولے کی کیفیت!

یکے دزد باشد دگر پردہ دار!

---


تہنیت گوئید مستاں را کہ

# طلوعِ اسلام کی نو سالہ کنونشن

بہ ہمہ آب و تاب، مورخہ ۱۰، ۱۱، ۱۲ نومبر ۱۹۶۷ء (بروز جمعہ، ہفتہ، اتوار)

حسبِ سابق، پرویز صاحب کے مکان واقعہ

۲۵- بی- گلبرگ ۲ (لاہور) میں

منعقد ہو گی۔ اس کے متعلق طلوعِ اسلام کی بزموں کو اطلاع دیدی گئی ہے۔ اور مزید تفصیلی ہدایات عنقریب بھیجی جائیں گی۔ بزموں کے اراکین کا قیام، حسبِ معمول، کنونشن گاہ میں ہو گا۔ دیگر حضرات صرف کھلے اجلاس میں سامعین کی حیثیت سے شرکت کر سکیں گے۔ اس کے متعلق پروگرام، طلوعِ اسلام کے آیندہ پرچہ میں شائع ہو گا۔ کنونشن میں خطابات و مذاکرات کے موضوع بہت اہم ہوں گے۔

جیسا کہ معلوم ہے، طلوعِ اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے، نہ مذہبی فرقہ سے۔ نہ ہی عملی سیاسیات میں حصہ لینا اس کے پروگرام میں شامل ہے۔ اس کا مقصد قرآنی فکر کو عام کرنا ہے تاکہ ہمارا معاشرہ صحیح قرآنی قالب میں ڈھل سکے۔ مجلہ طلوعِ اسلام، ادارہ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر، پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم اور اس پر مشتمل ٹیپ، اس فکر کی نشر و اشاعت کے ذرائع ہیں۔ طلوعِ اسلام کنونشن میں اس فکر کے مختلف گوشے نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ اسلئے اس میں شرکت آپ کیلئے موجبِ نفع بخشی اور ہمارے لئے باعثِ مسرت ہو گی۔

۲۵/بی - گلبرگ ۲ - لاہور (میرزا محمد خلیل)، صدر کنونشن کمیٹی

خورشید عالم

# ویٹ نام کا عالمی کردار

دوسری جنگِ عظیم کے بعد ایشیا میں سحرِ فرنگیانہ ٹوٹا تو ٹوٹتا چلا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں برصغیر آزاد ہو گیا۔ تنہا اس کی آزادی ایشیا میں سامراج کا دور ختم کرنے کے لئے کافی تھی۔ لیکن قیامِ پاکستان نے ایشیائی نہیں بلکہ عالمی سیاست میں ایک ایسے نئے عنصر کا اضافہ کیا جو آخر کار سامراج کی پسپائی اور شکست کا خصوصی ذمہ دار بن جائے گا۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی، حالات کی رو اس سے کہیں آگے نکل گئی۔ برصغیر کی آزادی کے دو سال بعد انڈونیشیا جیسا وسیع و عریض اور باہمہ وجوہ اہم علاقہ آزاد ہو گیا۔ انڈونیشیا یورپی استعمار کیخلاف برسرِ پیکار تو چلا آرہا تھا لیکن دوسری جنگِ عظیم میں اس کا مقابلہ جاپان سے آپڑا جس نے یورپی استعماری طاقت کو شکست دے کر وہاں سے بھگا دیا تھا۔ اس مقابلے نے انڈونیشیا کی تحریکِ آزادی کو بطورِ خاص تیز کر دیا۔ مجاہدینِ انڈونیشیا آزادی سے ہمکنار ہوتے تو جاپان مات کھا گیا اور استعمارِ یورپ پھر لوٹی ڈھٹائی سے آدھمکا اور تحریکِ آزادی کو اپنی عادتِ مشتومہ کے مطابق کچلنے لگا۔ اس میں البتہ اسے منہ کی کھانی پڑی اور شکست خوردہ ہو کر اسے انڈونیشیا سے نکل آنا پڑا۔ انڈونیشیا آزاد ہوا ہی تھا کہ رقبے اور آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا ملک یعنی چین نئی آب و تاب سے محفلِ اقوام میں نمودار ہوا۔ اسکے ضمیر میں ایک عرصہ سے انقلاب کا جو خمیر تیار ہو رہا تھا وہ مشہود ہو کر سامنے آگیا۔ اس انقلاب کا یہ پہلو فوری طور پر قابلِ غور تھا۔ کہ چین نے اپنے ہاں سے اس امریکہ کو بے دخل کیا ہے جو دنیا کی عظیم ترین طاقت تھا کیونکہ اس وقت تک وہ ایٹم بم ایسے خوفناک ترین ہلاکت آفریں ہتھیار کا بلا شرکتِ غیرے مالک تھا۔

ایشیا میں استعمارِ فرنگ کا جنازہ یوں اٹھ رہا تھا اور امریکہ پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ اس تنِ بے جان میں جانِ رفتہ کیسے لوٹائی جائے۔ وہ ایٹم بم سے جاپان جیسی عسکری طاقت کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر سکتا تھا لیکن ایشیائی اقوام کی تحریکِ آزادی سے عاجز آگیا تھا۔ اس تحریک کو روکنے اور استعمار کو سنبھالا دینے کے لئے اس نے کوریا کا جنوبی حصہ ہتھیایا اور اقوامِ متحدہ کی افواج کا ڈھونگ کھڑا کر کے

اس کے شمالی حصے کو روندتے ہوئے پھر سے چین تک پہنچنا چاہا۔ ایک عرصہ سر پٹخنے کے باوجود اس چور دروازے کو کھولنا تو ایک طرف رہا، وہ اس کے قریب بھی نہ پھٹک سکا۔ بازدہ پھر بھی نہ آیا۔ اس نے اپنا ساتواں جنگی بیڑہ جنوبی چینی سمندر میں متعین کر دیا۔ چین کے جزیرہ فارموسا پر قابض ہو گیا اور جنوبی کوریا اپنے تصرف میں لے لیا۔ امریکہ یہ دیوار چین تعمیر کرنے میں لگا ہوا تھا کہ اس کے پاؤں تلے کی زمین سرکتی دکھائی دی۔ چین کے جنوب میں ہند چینی پر فرانس قابض تھا اور امریکہ فرانس کی پوری طرح پشت پناہی کر رہا تھا۔ وہ فرانس کو ساز و سامانِ جنگ اور روپیہ پیسہ بے دریغ سے دے رہا تھا تاکہ استعمارِ فرنگ کی یہ چوکی قائم رہے۔ لیکن جو انجام چین میں امریکہ کا ہوا، وہی ہند چینی میں فرانس کا ہوا۔ فرانس نے ۱۹۵۴ء میں مجاہدینِ آزادی سے فیصلہ کن شکست اٹھائی تو اسے یقین ہو گیا کہ وہ اس علاقے میں قدم جما کے نہیں ٹھہر سکتا۔ چنانچہ وہ بوریا بستر لپیٹ کر واپس یورپ چلا گیا۔

ہند چینی میں فرانس کی شکست بالواسطہ اور بلاواسطہ دونوں لحاظ سے امریکہ کی شکست تھی۔ امریکہ فرانس کی مدد کر کے ایشیا میں اپنے ہی قیام کو طول دے رہا تھا۔ اس شکست سے یہ امید ختم ہوتی دکھائی دی، اور ایشیا کا جو منظر امریکہ کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا وہ اس کے لئے بڑا تشویشناک تھا۔ گو ملایا اور اس سے ملحق علاقوں میں انگریز ابھی موجود تھا تاہم اس کے تسلط کا دم واپسیں یقینی طور پر بر سرِ راہ تھا۔ انگریز کی اس موجودگی پر امریکہ جس قدر بھی تکیہ کرتا وہ اس "خلاء" کو گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ جو ایشیا بھر میں استعمار کے اٹھ جانے سے واقع ہو رہا تھا۔ پورا چین، پورا برصغیر، پھر ہند چینی ہاتھوں سے نکل چکے تھے۔ اس ابھرتے نقشے نے امریکہ کے فکر و عمل کے انداز بڑے واضح کر دیئے۔ اس نے استعمار کی قیادت ہی نہیں سنبھالی بلکہ خود اس کی علامت بن گیا۔ اور ایشیا میں استعمار کو از سرِ نو مسلط کرنے کے منصوبے بنانے اور انہیں روبہ عمل لانے میں دیوانہ وار لگ گیا۔ ۱۹۵۰ء کا سال اور اس کے قریب کا دور اس کی دیوانگی کا خصوصی مظہر ہے۔ وہ کوریا اور فارموسا پر پہلے ہی قابض ہو چکا تھا اور جنوبی چینی سمندر میں اپنا جنگی بیڑہ لا چکا تھا۔ اس نے آسٹریلیا، اور نیوزی لینڈ جیسے سفید فام ممالک سے گٹھ جوڑ کیا اور ایک معاہدے کی رو سے بظاہر خلافِ اشتراکیت اور بباطن خلافِ ایشیا محاذ کے قیام کی طرح ڈالی۔ اس خاکے میں امریکہ عمل کے کوئی رنگ بھی بھرتا، اس سے استعمار کی بحالی کے آثار نہ پیدا ہو سکتے تھے اور نہ ہوئے۔ اس سے امریکہ کا ہیجان و اضطراب اور بڑھا، اور وہ طرح طرح کی حرکاتِ مذبوحی میں لگ گیا۔ اس نے جنوبی کوریا سے معاہدہ دفاع یعنی عسکری معاہدہ کیا۔ اسی طرح کے معاہدات فلپائن، جاپان اور فارموسا سے کئے۔ اس سلسلے کی اور کڑی سیٹو کی شکل میں آئی۔

اتنا اہتمام کرنے پر بھی امریکہ کی تسلی نہ ہوئی۔ تسلی ہوتی بھی کیسے؟ استعمار کے قدم کہیں ٹک نہیں رہے تھے۔

اس پسِ منظر میں ہند چینی کا مسئلہ حل کرنے کے آثار بین الاقوامی سطح پر نمودار ہوئے اور جنیوا کانفرنس میں اس پر غور و خوض کر کے یہ طے کیا گیا کہ فی الوقت ویت نام کا شمالی حصہ ہوچی منھ اور ان کے رفقاء کی تحویل میں رہے اور جنوبی حصہ اس مقامی حکومت کے پاس رہے جس کی پشت پناہی استعمارِ یورپ کر رہا ہے۔ اس تقسیم کو عارضی قرار دیا گیا اور یہ طے کیا گیا کہ دو سال بعد یعنی جولائی ۱۹۵۶ء میں عام انتخابات کرا کے دونوں حصوں کو نئی حکومت کے تحت متحد ہو جانے دیا جائے۔ امریکہ اس فیصلے کو نہ تو روک سکتا تھا، اور نہ اسے قبول کر سکتا تھا۔ شمالی ویٹ نام آزاد کرا لیا گیا تھا اور جنوبی ویت نام میں آزادی کی زبردست رَو چل رہی تھی۔ ان حالات میں انتخابات کا نتیجہ یہی نکل سکتا تھا کہ پورا ملک ہوچی منھ کی قیادت میں متحد ہو جاتا۔ امریکہ اس نتیجے کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ لہٰذا، اس نے فیصلہ مان تو لیا لیکن ایسے حالات پیدا کرنے لگ گیا جن سے اس پر عمل نہ ہو سکے۔ اس نے فرانس کی جگہ خود لے لی اور ابنائے وقت تلاش کر کے انہیں ضرورت کے مطابق مسندِ حکومت پر بٹھلانے میں لگ گیا۔ ایک کاٹھ کی ہنڈیا جل جاتی تو وہ دوسری چڑھا دیتا۔ ان کٹھ پتلیوں کو اس نے کھل کھیلنے کا موقع دیا اور مالی اور جنگی امداد دے دے کر انہیں اشتراکیت کے مقابلے کے لئے تیار کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ امریکہ نے بہت بڑی مقامی فوج تیار کر لی۔ اور یوں ایسی فضا پیدا کر دی جس میں جنگ کی بات تو ہو سکے لیکن امن اور اتحاد کا نام نہ لیا جا سکے۔

۱۹۵۴ء میں جنیوا کانفرنس میں یہ طے ہوا تھا کہ دو سال کے عرصے میں بین الاقوامی نگرانی میں ویٹ نام کے دونوں حصوں میں انتخابات کرائے جائیں گے اور ان کے نتائج کے مطابق مرکزی حکومت مرتب کر کے دونوں حصوں کو اس کی تحویل میں دے کر ویٹ نام کو متحد کر دیا جائے گا۔ جیسے بھارت کو یقین تھا کہ کشمیر میں استصواب کرا کے اسے دستبردار ہونا پڑے گا اسی طرح امریکہ کو یقین تھا کہ ویٹ نام میں انتخابات ہو گئے تو اس کے لئے آزاد، متحد اور غیر جانبدار ویٹ نام میں کوئی جگہ نہیں رہے گی۔ چنانچہ اس نے ویٹ نام میں انتخابات کرانے کی نوبت نہ آنے دی اور یہ عذر پیش کرتا رہا کہ انتخابات کرا کے وہ پورے ملک کو اشتراکیت کے حوالے نہیں کر دینا چاہتا۔ جب یہ یقین ہو گیا کہ امریکہ انتخابات کو ناممکن العمل بنا رہا ہے اور ملک کے جنوبی حصہ کو اپنی فوجی چھاؤنی میں منتقل کر رہا ہے تو وہ عناصرِ بغاوت جو جنیوا کانفرنس کے فیصلوں سے دب گئے تھے، پھر سے اُبھر آئے۔ شمالی ویٹ نام تو سارا آزادی پسندوں کے تصرف میں آ گیا تھا۔ خود جنوبی ویٹ نام میں کثیر تعداد میں آزادی پسند تھے جنہوں نے فرانس سے نکلو خلاصی کرانے کے لئے اس کے خلاف شد و مد سے لڑائی لڑی تھی۔ اور اس کی شکست اور بے دخلی کا باعث بنے تھے۔ یہ

آزادی پسند پھر سے میدانِ عمل میں آگئے اور جنوبی ویٹ نام میں آزادی کی جنگ کا دوسرا دور شروع ہوگیا۔

اس دور میں فرانس جا چکا تھا اور امریکہ مسلط ہو چکا تھا۔ جیسے پہلے امریکہ نے فرانس کی مدد کی تھی۔ اسی طرح اب امریکہ نے اس (جنوب) ویٹ نامی حکومت کی مدد کی جسے اس نے بطور اپنے کارندے کے اپنی استعماری مطلب براری کے لئے حکومت کا نام دیا تھا۔ اس طرح ویٹ نامی ویٹ نامیوں سے لڑے۔ یہ جنگ اس لحاظ سے غیر مساوی تھی کہ ایک طرف شدید اور ناقابلِ شکست جذباتِ بغاوت و حریت تھے اور دوسری طرف ابنائے وقت تھے جو وقتی مفاد اور مصلحت کی بنا پر امریکی استعمار کے آلہ کار بن گئے تھے۔ مردانِ حُر کے مقابلے میں مردانِ آزر نہ ٹھہر سکتے تھے نہ ٹھہرے۔ بغاوت کامیاب ہونے لگی اور آزادی کی رَو کو جنگ کے شعلوں نے اور ہوا دی۔ امریکہ کے آلہ کار ویٹ نامی سپاہی آہستہ آہستہ وطن پرستانہ جذبات سے مغلوب ہو کر آزادی پسندوں سے ملنے لگے اور زیادہ سے زیادہ علاقے آزاد ہونے لگے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر امریکہ نے تمام بین الاقوامی آداب و اخلاق کو بالائے طاق رکھ دیا اور وہ ایک فریق کی حیثیت سے لڑائی لڑنے لگ گیا۔ ایک فریق تو وہ پہلے سے ہی تھا لیکن پہلے وہ براہِ راست لڑ نہیں رہا تھا بلکہ ویٹ نامیوں کو آپس میں لڑا رہا تھا اور ایک طرف کے ویٹ نامیوں کی ہر طرح امداد کر رہا تھا۔ اب اس نے یہ لبادہ اتار پھینکا اور عریاں ہو کر متحارب فریق بن گیا۔ چنانچہ امریکی فوجوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہونے لگا اور جنگ کی آگ ہر طرف پھیلنے لگی۔ اب امریکی فوجوں کی تعداد پانچ لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔ اور وہ براہِ راست ویٹ نام کے خلاف لڑ رہی ہیں۔ گو ان کا مقابلہ ان ویٹ نامیوں سے ہے جو اپنے آپ کو ویٹ کانگ کہلاتے ہیں اور جنوبی ویٹ نام میں آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں، تاہم امریکہ نے شمالی ویٹ نام کو بھی جنگ کی لپیٹ میں لے لیا ہے جیسے جنوبی ویٹ نام میں ویٹ نامی نہیں بلکہ امریکی لڑ رہے ہیں اسی طرح امریکہ یہ سمجھتا ہے کہ جنوبی ویٹ نام کے آزادی پسند از خود امریکہ کے خلاف نہیں لڑ رہے بلکہ شمالی ویٹ نام کی فوجیں وہاں آکر امریکہ کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ اور شمالی ویٹ نام کی فوجیں اس لئے جنوبی حصے میں آکر لڑ رہی ہیں کہ چین انہیں برانگیختہ بھی کر رہا ہے اور ان کی ہر طرح مدد بھی کر رہا ہے۔ اپنے کردار اور تجربے کا ہر عکس ویٹ نام کے آئینے میں دیکھ کر پہلے وہ شمالی ویٹ نام کے جنوبی علاقوں پر حملے کرتا رہا۔ تاکہ، اس کے خیال کے مطابق، شمال سے فوجیں جنوب میں نہ پہنچ سکیں۔ پھر اس نے دائرہ جنگ کو اور پھیلانا شروع کر دیا اور شمالی ویٹ نام کے شمال میں چین سے اس کی ملتی سرحد کے ساتھ ساتھ حملے کرنے لگا تاکہ چین سے اسے مدد نہ پہنچ سکے۔ اب وہ شمالی ویٹ نام پر اندھا دھند حملے کر رہا ہے۔ ایک ایک دن میں امریکہ اتنے بم گرا آتا ہے، جتنے

دوسری جنگِ عظیم میں جرمنی جیسے دشمن پر مہینوں میں نہیں گرائے گئے تھے۔

امریکہ کے بعض نقیب امریکی استعماری خبثِ باطن کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہاں تک کہہ چکے ہیں کہ ان کے پاس اتنی طاقت ہے کہ وہ چاہیں تو شمالی ویٹ نام کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیں، اور یہ لوگ جن کے دماغ میں آزادی کا خناس سمایا ہوا ہے، ہیں بھی نیست و نابود کر دینے کے قابل۔ امریکہ چاہتا یہ کچھ ہے۔ اپنے غیر معمولی ہلاکت بار ساز و سامانِ جنگ کے انبار دیکھ کر وہ یہ یقین بھی کر لیتا ہے کہ وہ اپنی اس غیر انسانی خواہش کی تسکین بھی کر سکتا ہے۔ لیکن اس کی تسکین کے لئے اس نے جنگ کو ہر طرف پھیلایا۔ اور اس جنگ میں بری، بحری اور فضائی قوت کو پوری طرح جھونک دیا۔ پھر بھی مطلوبہ نتائج برآمد ہونے کے آثار تک پیدا ہوتے دکھائی نہیں دے رہے۔ الٹا ویٹ کانگ کی جنگ آزادی کی آگ زیادہ شدت سے بھڑکنے لگی ہے۔ اور اب حال یہ ہے کہ جنوبی ویٹ نام کا اسّی فی صد حصہ ویٹ کانگ کے تصرف میں ہے۔ اپنی تدبیر پر مشیت کو یوں خندہ زن دیکھ کر امریکہ آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ اور بے ساختہ اپنے ایٹم اور ہائیڈروجن بموں کے ذخیروں کی طرف لپکتا ہے۔ یہ ذخائر، جو جنگِ عظیم کے بعد اس کی عالمی برتری کی زندہ ضمانت تھے، اب اس کی بے چارگی کی بین شہادت بن گئے ہیں۔ وہ یہ ساز و سامان رکھتے ہوئے بھی اسے استعمال کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ زمانے کے تیور ایسے بدل گئے ہیں اور ویٹ نام کے جذبۂ حریت نے عالمی توجہ کو اس طرح اپنی طرف منعطف کر لیا ہے کہ امریکہ قوت کے اس ابلیسی سرچشمے کی طرف دیکھتا ہے تو اس کے اپنے ہی جسم کے بعض حصوں میں خون منجمد ہو جاتا ہے۔ خود اندرون امریکہ اس بے پناہ طور پر ہلاکت بار ساز و سامان کے استعمال کے خلاف ایسی رائے ابھر آئی ہے کہ اس کے جنونی قائدین بے دست و پا سے ہو گئے ہیں۔ وہ یہاں تک درماندہ ہو گئے ہیں کہ، مثلاً، پاکستان سے بار بار درخواست کرتے ہیں کہ وہ دو ڈاکٹر ہی وہاں بھیج دے تاکہ امریکہ یہ کہہ سکے کہ اسے ایک ایشیائی ملک کی اتنی سی حمایت حاصل ہے، اور اس سے اسے کچھ اخلاقی تقویت پہنچے۔ کہیں کسی سے اخلاقی امداد حاصل کرنے کی امید موہوم میں وہ کبھی کبھی اپنے جنگی جنون کا یہ معذرت خواہانہ جواز پیش کرتا ہے کہ وہ نہ شمالی ویٹ نام کو شکست دینا چاہتا ہے اور نہ اسے تباہ و برباد کر دینے کے لئے کوشاں ہے۔ وہ جنگ کے زور پر شمالی ویٹ نام کو امن و صلح کی گفتگو پر آمادہ کرنا چاہتا ہے۔ اس سے امریکہ کی عالمی تنہائی اور نفسیاتی بے چارگی کا پتہ چلتا ہے۔ ویٹ نام میں اسے امن چاہیئے تو اس کے لئے جنیوا کانفرنس نے تیرہ سال پہلے راستہ ہموار کر دیا تھا۔ اس کانفرنس کے فیصلوں پر عمل کرنے دیا جاتا تو ویٹ نام گیارہ سال پہلے متحد اور غیر جانبدار ملک بن گیا ہوتا اور اس حصۂ ایشیا میں آج امن ہوتا۔ اب بھی امریکہ کو امن درکار ہے تو اس کے لئے جنوبی ویٹ نام کو جنگی چھاؤنی بنانے

اور بنائے رکھنے کی ضرورت نہیں۔ شمالی ویٹ نام بجا طور پر اس سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنی فوجیں ویٹ نام سے نکال لے تاکہ بین الاقوامی نگرانی میں شمالی اور جنوبی ویٹ نام میں انتخابات کرائے جائیں۔ یہی جنیوا کانفرنس کا فیصلہ ہے اور امریکہ اس فیصلے پر کاربند رہنے پر پابند ہے۔ لیکن اس واحد ذریعۂ امن کو آزمانے کے لئے وہ تیار نہیں۔

دراصل، امریکہ کو ویٹ نام میں امن و سکون نہیں چاہیئے۔ وہ اس رگ سے جسم ایشیا میں استعماریت کا وہی زہر داخل کر رہا ہے جو دوسری جنگِ عظیم کے بعد نچوڑ کے نکالا جا رہا تھا۔ اور بہت حد تک نکل بھی چکا تھا۔ ایشیا کی عام رگیں اس زہر کو نہ قبول کر سکی ہیں اور نہ قبول کر سکیں گی۔ لیکن بھارتی برہمنی رگ نے اسے امرت سمجھ کر قبول ہی نہیں کیا بلکہ اسے سارے جسم میں پہنچانے کے لئے پھڑک رہی ہے۔ امریکہ کو اس سے بڑی شہ ملی ہے کیوں کہ جو تائید اسے پاکستان جیسے حلیفِ مغرب اور شریکِ سیٹو ملک تک سے نہیں مل سکی تھی، وہ بھارت ایسے غیر جانبداری کے دعوے دار ملک سے میسر آگئی ہے۔ گو امریکہ کا استعماری کردار کھل کے ویٹ نام میں سامنے آیا ہے، تاہم بنظرِ غائر دیکھا جائے تو وہ چین میں بھی استعماری جنگ ہی لڑ رہا تھا۔ اور کوریا میں بھی اس کے عزائم سرتاپا استعماری تھے۔ اس کے عزائم ویٹ نام سے پہلے کھل کے سامنے اس لئے نہیں آئے کہ دوسری استعماری طاقتیں ایشیائی ممالک پر مسلط تھیں اور دنیا کی نظریں ان کے استعمار پر لگی ہوئی تھیں۔ امریکہ کسی ملک پر قابض نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ استعمار کا موید ہو سکتا تھا، استعماری نہیں کہلا سکتا تھا۔ لیکن ویٹ نام میں آکر وہ اکیلا میدان میں رہ گیا۔ اور یورپ کے استعماری ممالک ایک ایک کر کے بساطِ استعمار تہ کر کے نکل جانے پر مجبور کر دیئے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک وقت تک امریکہ کو استعماری نہیں کہا جا سکا اور ویٹ نام میں اس کے کردار کے متعلق خوش فہمی رہی۔ یہ راز آہستہ آہستہ کھلا کہ امریکہ استعمار کا خلاء استعمار ہی سے پُر کرنا چاہتا ہے اور ویٹ نام اس کے لئے استعماری تجربہ گاہ اور محاذ کا درجہ رکھتا ہے۔

کوریا میں امریکہ کا کردار بعینہٖ یہی تھا لیکن بین الاقوامی سطح پر غلط فہمی کی یہ صورت رہی کہ امریکی افواج کو اقوامِ متحدہ کی افواج کہا اور سمجھا جانے لگا۔ اور پاکستان سمیت متعدد ممالک امریکہ کی عملی امداد نہ بھی کر سکے لیکن انہوں نے اخلاقی امداد سے دریغ نہیں کیا۔ یہ تجربہ امریکہ کو ویٹ نام میں آکر ہوا، کہ وہ یکہ و تنہا ہے اور ایشیائی ذہن یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ اسے یہ حق حاصل ہے کہ ہزاروں میل دور سے آکر اپنی فوجیں ویٹ نام میں جمع کرے اور کرتا جائے، اور اہلِ ملک کو بزورِ شمشیر مجبور کرے کہ وہ سیاسی، معاشی اور معاشرتی تشکیل کے لئے امریکہ ہی کے دست نگر رہیں۔ اس سے ویٹ نام

کی جنگِ آزادی ایک ملک یا قوم کی اپنی آزادی کی جنگ کی سطح سے بلند ہو کر ایشیا کی خلافِ استعمار جنگ کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ویٹ نام ان تمام ممالک کی ہر طرح کی امداد کا مستحق ہے جو استعمارِ یورپ کو انسانیت کے لئے کابوس سمجھتے ہیں۔ استعمار یورپ کی جنگ ویت نام کے ایک نقطے پر مرکوز ہونے کی وجہ سے قابلِ فہم ہو گئی ہے۔ لیکن یہ فیصلہ کن یا نتیجہ خیز ہو سکے گی یا نہیں، اس کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ ویٹ نام میں استعمارِ فرنگ کے خلاف جو جذبہ کام کر رہا ہے وہ بڑا خالص اور متشدد ہے۔ یہ اسی خلوص اور اشتداد کا نتیجہ ہے کہ اہل ویٹ نام نے پہلے فرانس جیسی با جبروت طاقت کو شکست فاش دی اور اب برسوں سے امریکہ جیسی درجہ اول کی عالمی طاقت کے خلاف پامردی سے صف آرا ہیں۔ ان کے جذبے میں صداقت کی کمی ہوتی تو وہ کم و بیش بیس سال اس کامیابی اور عزم کے ساتھ نبرد آزما نہ رہ سکتے۔

ویٹ نام کے مجاہدانہ کردار سے یوں تو توقع رکھی جا سکتی تھی کہ استعمارِ فرنگ کیخلاف جنگ کا یہ فیصلہ کن مورچہ ثابت ہوتا لیکن برہمنی بھارت نے اپنے آپ کو اس حد تک استعمارِ فرنگ کے قدموں پر ڈال دیا ہے، کہ یہ دکھائی دینے لگا ہے کہ فیصلہ کن جنگ کا میدان ویٹ نام نہیں کوئی اور ہو گا۔ اس سے ویٹ نام کے کردار پر معمولی سا حرف بھی نہیں آتا۔ انسانیت کو استعمار کی لعنت سے حتمی طور پر آزاد ہونے کے لئے کتنے ہی معرکے اور کیوں نہ لڑنے پڑیں، ان میں معرکہ ویٹ نام کی حیثیت نمایاں اور امتیازی دکھائی دیگی۔ تاریخ ان خلافِ استعمار بہادروں کو ہمیشہ خراجِ عقیدت پیش کرتی رہیگی۔ خود امریکہ کو اس کا پورا پورا یقین ہے کہ وہ استعماری جنگ جیت نہیں سکتا لیکن اس کی استعماری ذہنیت کا خاصہ یہی ہے کہ جنگ پر جنگ لڑتا جائے اور نئے سے نئے محاذ اس احمقانہ خوش فہمی میں کھولتا جائے کہ وہ اپنی تدابیر کے نقائص دور کرنے میں، اور بالآخر استعمار کے جھنڈے گاڑ لینے اور گاڑے رکھنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اب اس کی نظریں بھارت پر جم رہی ہیں۔ جیسے وہ چین میں موجود ہوتے ہوئے ہند چینی میں فرانس کی کھلے بندوں حمایت کرنے لگ گیا تھا۔ اسی طرح وہ ویٹ نام میں الجھے ہوئے بھی بھارت کے محاذ کو بظاہر اشتراکیت، فلہٰذا چین کے خلاف لیکن دراصل ایشیا کے خلاف تیار کرنے میں لگا ہوا ہے۔ بھارت کا پہلے چین پر اور پھر پاکستان پر حملہ اسی تیاری کے کرشمے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ امریکہ جنگ کو ویٹ نام کے محدود حلقے میں سمیٹ کر بھرپور قوت سے اپنے مفید مطلب بنا لینے کی فکر میں تھا لیکن مشیت اس جنگ کے محاذ کو وسعت دیتی جا رہی ہے تاکہ امریکہ کے عزائم پوری طرح بے نقاب ہوں۔ اس کی طاقت زیادہ سے زیادہ منتشر ہو اور خلافِ استعمار قوتیں معاون و متحد ہو کر استعمارِ فرنگ پر کاری اور فیصلہ کن ضرب لگائیں۔ مشیت کے نشتر پوری طرح بے نقاب تو ہوتے ہوتے ہونگے لیکن ویٹ نام میں وہ اس حد تک ضرور سامنے آ گئے ہیں کہ آگے چل کر ان کے پوری طرح استعمال ہونے کا یقین آنے لگا ہے۔

# رابطۂ باہمی

**بزمِ لاہور**

طلوع اسلام کنونشن کے انعقاد کی تاریخوں کا اعلان کیا جا چکا ہے۔ چونکہ یہ بزم کنونشن میں میزبان کے فرائض سرانجام دیتی ہے، اس لئے اراکینِ بزم نے اس سلسلے میں انتظامات ابھی سے شروع کر دیئے ہیں۔ اور ان کی توجہات بیشتر اسی طرف مبذول رہی ہیں۔

(۲)۔ ۶ ستمبر ۶۷ء کو بعد دوپہر متفقین و معاونینِ تحریکِ طلوع اسلام کے اعزاز میں ۲۵/بی گلبرگ میں ایک عصرانہ دیا گیا۔ احباب کے باہمی تعارف کے بعد نمائندہ بزم نے بزمِ طلوع اسلام کی غرض و غایت اور طریقِ کار پر روشنی ڈالی اور آئندہ کے پروگرام سے انہیں مطلع کیا۔ بعد نماز مغرب یہ حسین و شاداب اجتماع ختم ہوا۔

(۳) بزم کے زیر اہتمام ۸ ستمبر ۱۹۶۷ء بعد دوپہر یوم دفاعِ پاکستان کے سلسلے میں، وائی، ایم، سی، اے ہال میں ایک پبلک جلسہ منعقد ہوا جس میں پرویز صاحب نے تقریر فرمائی۔ جنگ کا پس منظر اور مجاہدین کے کارناموں کو نہایت دلنشیں انداز میں بیان فرمایا۔ تقریر نہایت جذب و انہماک سے سنی گئی اور یہ اجتماع بہت کامیاب رہا۔ (یہ تقریر اسی پرچہ میں شائع کی جا رہی ہے)

(۴) بزم کے پندرہ روزہ اجتماعات باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ تحریک کے فروغ کے سلسلے میں جامع پروگرام مرتب کیا جا رہا ہے۔ شہر میں جلسوں اور اجتماعات وغیرہ میں پمفلٹس کی تقسیم کا کام جاری ہے۔ درسِ قرآنِ کریم کے اجتماع میں بدستور اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔

**بزمِ کراچی**

سندھ اسمبلی ہال میں پرویز صاحب کے ٹیپ شدہ درسِ قرآن باقاعدگی سے سنائے جا رہے ہیں۔ بزم کے زیر اہتمام ۱۰ ستمبر کو یومِ دفاعِ پاکستان کی تقریب منائی گئی۔

رسالہ طلوع اسلام و دیگر لٹریچر کی تقسیم کا کام نہایت محنت اور خوش اسلوبی سے جاری ہے۔ اللہ تعالےٰ ان کے نیک ارادوں اور عزائم میں استقامت عطا فرمائے۔

**بزمِ لائلپور**

ٹیپ شدہ درسِ قرآن کا سلسلہ باقاعدگی سے جاری ہے۔ گوجرہ میں درسِ قرآن کا سلسلہ شروع کرنے کے انتظامات کئے جا رہے ہیں۔ رسالہ اور دیگر لٹریچر کی تقسیم کا کام بڑے ذوق و انہماک سے جاری ہے،

**دیگر بزمیں**

اپنی اپنی جگہ تحریک کے فروغ کے لئے اور اس آواز کو ملک کے گوشے گوشے تک پھیلانے کے لئے سعی و کاوش کر رہی ہیں۔ اللہ تعالےٰ ان کے نیک ارادوں میں برکت اور استقامت عطا فرمائے۔

# "علمائے کرام" ایک عالم کی نظر میں

[ (مولانا) آزاد سبحانی مرحوم، ہمارے دور کی ایک بڑی نمایاں شخصیت تھے۔ ایک جید عالم اور حریتِ اسلامی کے مبلغ اور داعی۔ جب (مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) کو، ان کی ہندی نیشنلزم کے مسلک کی بنا پر، کلکتہ کے مشہور اجتماعِ عید کی امامت وخطابت سے، مسلمانوں نے الگ کیا ہے، تو ان کی جگہ فریضۂ امامت وخطابت، (مولانا) آزاد سبحانی مرحوم کو تفویض کیا گیا تھا۔ ہمیں کراچی کے ایک دوست نے، (مولانا) آزاد سبحانی کے ایک خطبہ صدارت کا اقتباس ارسال فرمایا ہے جسے انہوں نے کلکتہ میں یومِ پاکستان کی تقریب پر ۲۳ مارچ ۱۹۴۵ء کو ارشاد فرمایا تھا۔ "اس اقتباس کے مطالعہ کی ـــ ان کے الفاظ میں ـــ "آج بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ ۲۲ سال پہلے تھی۔" ہم اس اقتباس کو اپنے اس کرم فرما کے شکریہ کے ساتھ درج ذیل کرتے ہیں۔ طلوعِ اسلام ]

---

عُرفی "علمائے کرام" اس مغالطہ میں ہیں کہ وہ دین کے عالم ہیں، اس لئے وہی تنہا عالم ہیں باقی سب جاہل۔ لفظ "عالم" کا اطلاق ان پر اپنی مطلق حیثیت میں مغالطہ کا ایک خاص سبب بن گیا ہے۔ حالانکہ وہ صرف عالمِ دین بلکہ عالمِ فقہ ہیں۔ باقی علومِ دنیا سے جاہل ہیں۔ جماعتِ مسلمین جن میں دنیوی علومِ راجحہ کے ماہرین وفاضلین شامل ہیں، صرف فقہ کے عالموں کی قیادت کیسے قبول کر سکتی ہے۔ دین ضابطۂ دنیا کا نام ہے۔ جس کو سمجھنا دنیا کے سمجھنے پر موقوف ہے۔ اس لئے حقیقت میں نہ وہ علمائے دین ہیں نہ علمائے دنیا۔ ان کا ایک مغالطہ یہ بھی ہے کہ وہ قرآن کے عالم ہیں اور قرآن جملہ کائنات کے علم کا عطر و مخزن ہے۔ اس لئے ان کا علم جمیع کائنات پر حاوی ہے۔ ان بیچاروں کو یہ معلوم نہیں کہ اگر علم قرآن کو اس وسعت وجامعیت تک پھیلا دیا جائے تو ان علمائے عرفی کو علم قرآن سے اتنا ہی کورا ماننا پڑے گا جتنا کہ ایک امّی کو۔ کیونکہ اس جامعیت کے ساتھ قرآن کا علم جمیع کائنات کے علم پر موقوف ہے، اور علمِ کائنات سے انہیں کیا واسطہ!

ربّ العالمین کی دو کتابیں ہیں، ایک قولی یعنی قرآن، اور ایک عملی یعنی صحیفۂ فطرت۔ کتاب قرآن کا سمجھنا، تفسیر کرنا اللہ کی عملی و تکوینی کتاب کائنات کے سمجھے بغیر دشوار و محال ہے۔ قرآن کی حقیقی تفسیر زمانہ اور وقت کرتا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ موجودہ عربی علما۔ جامعیت کے درجہ میں قرآن کے ایک شوشہ کا بھی علم نہیں رکھتے۔ وہ صرف الفاظِ قرآن کے عالم ہیں یا معانی لغوی کے۔ حقائقِ قرآن کے علم سے انہیں کیا نسبت؟ جن دینی مدارس سے یہ حضرات علمائے عربی برآمد ہوتے ہیں وہ خود پوست و قشر سے زیادہ نہیں۔ ان کا دقیانوسی نصابِ تعلیم کیا اس قابل ہے کہ دین و قرآن کی وسعت پذیر حقیقتوں پر جو ہر دورِ جدید میں اُس دور کی جدید وسعتوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہیں اپنے طالبین کو مطلع کر سکتا ہے؟

پھر انہیں غرّہ ہے کہ وہ وارثِ نبیؐ ہیں اور اس لئے امتِ نبیؐ کے موروثی قائد۔ لیکن نبیؐ کی وراثت صرف نبیؐ کی سیرت پڑھ لینے سے حاصل نہیں ہوتی جب تک نبیؐ کی حقیقت ان میں جلوہ فگن نہ ہو، نبیؐ کی سیرت ان میں جلوہ ریزی نہ کرتی ہو، پھر کیا از روئے حقیقت علمائے عربی میں ان چیزوں کی موجودگی کا سنجیدہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے؟ کیا ان میں وہی فروتنی و خاکساری ہے جو نبی کریمؐ میں تھی۔ کیا ان میں وہی ہمدردی و خدمتِ خلق کا جذبہ ہے جو نبی کریمؐ میں تھا۔ اور اتحادِ امتِ اسلامیہ سے انہیں وہی دلچسپی و والہانہ محبت ہے جو سرورِ عالمؐ میں ہر وقت درخشاں تھی؟ کیا وہ اصلاح بین المسلمین کا وہی شغف اور غلبۂ اسلام و اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے وہی جذبۂ سرفروشی رکھتے ہیں جو نبی کریمؐ میں تھا اور جس کی بنا پر وہ خدا کے لئے ساری خدائی کے مقابل کھڑے ہو گئے تھے؟ پھر کیا ان میں معرفتِ الٰہی کا وہی ملکوتی رنگ موجود ہے جو نبی کریمؐ پر چھایا ہوا تھا؟ واقعات پکارتے ہیں اور حقیقت پکار پکار کر کہتی ہے کہ نبی کریمؐ کے ان عملی جوہروں میں سے ایک جوہر بھی ان میں موجود نہیں ہے۔ پھر وراثتِ نبیؐ کا دعوےٰ کس منہ سے؟ کیا نبی کریمؐ سے ان کو وراثت میں صرف مسواک، ڈاڑھی و عمامہ کی سی ظاہری چیزیں ہی ملی ہیں یا نبی کریمؐ کے باطنی عظیم الشان خزانۂ بے کراں سے بھی انہیں کچھ حاصل ہوا ہے؟

حکیم شمس الرحمٰن خان صاحب (دہلوی)
اب
۱۰ ڈی مین بازار۔ دھرم پورہ۔ لاہور (۱۵)
میں مطب فرماتے ہیں!

پروفیسر محمد قاسم مظہر
ایم۔اے (تاریخ) ایم۔اے (اسلامیات)

# ملّائیت

## ایک تاریخی جائزہ

۵۷۰ء میں مکہ میں نبی آخر الزمان حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش کے وقت مہذب دنیا میں دو بڑی حکومتیں موجود تھیں۔ ایک طرف مغرب میں رومی عیسائی حکومت تھی اور دوسری طرف مشرق میں ایرانی زرتشتی مذہب کی پیروکار شہنشاہیت تھی۔ گو کہ دونوں سلطنتوں کی بنیادیں مذہب پر قائم تھیں اور سربراہانِ حکومت بلند بانگ انسانی اقدار کے تحفظ کے نعرے لگاتے رہتے، لیکن جیسا کہ قرآن میں مذکور ہے اور جس کی تائید تاریخ سے ہوتی ہے، مذہب کو آلۂ کار بنا کر حکومت کے بااثر اشخاص اور حکمران انسانیت کا گلا گھونٹ رہے تھے۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو جب نبوت عطا ہوئی تو انہوں نے خدا کے احکامات کی روشنی میں ایسی باطل قوتوں کے خلاف آواز اٹھائی۔ چونکہ ان قوتوں کی طاقت کا سرچشمہ مذہبی دعویداری کرنے والا ایک خاص طبقہ تھا جو اپنی مرضی کے مطابق نہ صرف مذہبی احکامات کی تاویل کیا کرتے تھے بلکہ ان میں تبدیلی کرنے سے بھی خائف نہ تھے۔ اس لئے اسلام نے انسانیت کی خدمت کا فرض ادا کرنے کے سلسلہ میں سب سے پہلے مخلوق خدا کو اس طبقے کی چیرہ دستیوں سے مطلع کرتے ہوئے علی الاعلان کہا کہ "لا رھبانیۃ فی الاسلام" جس کا مدعا یہ ہے کہ بنی نوع انسان پر یہ بات واضح کی جائے کہ ان کی بھلائی کے لئے خدائے وحدہٗ لاشریک جو دین اس کے لئے پسند کر چکا ہے اس میں کسی طبقہ کو جاگیرداری کا حق نہیں دیا گیا کہ اسکے بل بوتے پر وہ اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کی تکمیل کرے۔

خلافتِ راشدہ کے زمانے میں ایران، شام اور شمالی افریقہ کے اکثر حصے اسلامی حکومت میں شامل ہوئے۔ یعنی زرتشتی مذہب کی دعویدار تمام مشرقی سلطنت اور رومی عیسائی حکومت کا ایک بڑا حصہ مسلمانوں کے قبضہ میں آیا۔ جہاں مسلمان حق دین کی تبلیغ کرنے لگے۔ لیکن اس وقت مذہب اسلام صرف ایک

خالی خولی نظریاتی نسخہ نہیں تھا بلکہ اس کا تعلق عمل سے تھا۔ جہاد مسلمان کا محبوب درس اور قرآنی احکام اس کے زندگی کے درخشاں اصول تھے۔ عمل کے بل بوتے پر مسلمان نے اقوامِ عالم کے سامنے ایک مثالی زندگی پیش کی جس کے سامنے عیسائی، یہودی اور زرتشتی مذاہب کے لچکدار، امارت پرست اور طبقہ نواز اصول نہ ٹھہر سکے۔ چنانچہ ایک قلیل عرصہ میں مسلمان دنیا کے ایک بڑے حصے کے انسانوں کے لئے رحمت کا باعث بنا۔

خلافتِ راشدہ کے بعد اموی حکومت کے زمانے میں اگر ایک طرف فتوحات کی طرف توجہ دی گئی، تو دوسری طرف علوم و فنون کے حصول کی طرف بھی مسلمان متوجہ ہوتے۔ چنانچہ قرآنی علوم کی تدوین کے ساتھ ساتھ مفتوحہ اقوام کے علوم سے بھی استفادہ کیا گیا۔ لیکن اس دور میں غیر اقوام کے علوم کے مطالعے کا مطلب صرف اُن کے ساتھ اسلام کا تقابلی جائزہ لینا تھا تاکہ اسلام کی تبلیغ کے لئے راستے ہموار کئے جا سکیں۔ اور چونکہ اس دور میں بھی مسلمان بحیثیت مجموعی اپنے آپ کو اسلام کی خاطر ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے وقف کر چکے تھے، اس لئے سوائے قرآن کی درخشاں تعلیم کے دوسرے علوم ان کیلئے باعث کشش نہ بن سکے۔

خلافتِ عباسیہ کے قائم ہونے کے بعد ابتدائی پُرآشوب دور گزرنے کے ساتھ ہی مسلمانوں کی زندگی میں ایک عجیب انقلاب رونما ہوا۔ فتوحات اور اسلام کی تبلیغ کا جذبہ آہستہ آہستہ سرد ہونے لگا۔ اور مفتوحہ ممالک سے حاصل کردہ دولت کی بنا پر امراء و اراکینِ مملکت عیش و عشرت کی زندگی اپنانے لگے۔ چنانچہ اس کا اثر اُن سے قریبی تعلق رکھنے والے ثانوی طبقے پر بھی ہونے لگا۔ اس طبقے نے تہذیب و ثقافت کے فروغ کے نام پر ہر قسم کے علوم کی سرپرستی کی طرف توجہ دی۔ چنانچہ آہستہ آہستہ ایک خاص طبقہ نے علوم و فنون کو اپنی جاگیر بنایا۔ اور چونکہ عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور نے اپنے خاندان میں خلافت کو مستقل کرنے کے لئے خلافت کا روحانی لبادہ بھی اوڑھ لیا جس کے ذریعے خلفائے بنو عباسی نہ صرف دنیا دی شہنشاہ بنے بلکہ تمام عالم اسلام کے لئے روحانی پیشوائیت بھی ان کے قبضۂ قدرت میں آئی۔ اس لئے اس نظریہ کی تقویت کے لئے بنو عباس کو فرعون و ہامان کے تعلق کی طرح اس نئے علمی جاگیردار طبقے کی امداد کی ضرورت پڑی تاکہ یہ طبقہ ان کی مرضی کے مطابق اصول و ضوابط کی تشریح کرے۔ ایک طرف منصور کی اس تاریخی بدعت اور دوسری طرف روم و فارس کے علوم کے مطالعہ نے اس مخصوص طبقے کو موقع دیا، کہ اسلام میں بھی عیسائی، کلیسائی نظام اور زرتشتی مذہبی مخصوص طبقے جیسا ایک علیحدہ تنظیم قائم کرے جس کا مقصد یہ ہو کہ مذہبی مسائل کی تشریح و تفسیر ایک خاص گروہ کے ہاتھ میں آئے۔ عوام کو حتی الوسع قرآنی

احکامات سے بے خبر رکھا جائے اور اس تشریح کے بل بوتے پر ایک طرف وہ حکمران طبقہ کو اپنا محتاج بنا دے اور دوسری طرف عوام کو اپنے قابو میں رکھ کر اپنا اقتدار قائم رکھیں۔ اپنی قوت کو مضبوط کرنے کے لئے اس گروہ نے جیروم ( JEROME ) کی رہبانیت کے فلسفہ، افلاطونی، نوافلاطونی اور زرتشتی فلسفیانہ علوم سے کافی استفادہ کیا۔ اور یہی اسلام کی جو سرے سے مذہب کو ایک خاص گروہ کے ہاتھوں میں دینے کا مخالف تھا، کلیساتی پیشوائیت کا وہ حربہ تھا جسے ہم ملائیت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس طبقہ کی بدولت اسلام نے وہ رنگ اختیار کر لیا جس کو نیست و نابود کرنے کے لئے خود اسلام آیا تھا۔ اس گروہ کی مہربانیوں کی وجہ سے بغداد میں جو نزاعات ہوئیں اور آخر کار عباسی حکومت جس کا شکار ہوئی، تاریخ کی کتابیں ان سے بھری پڑی ہیں۔

ہلاکو کے بعد سقوط بغداد سے اگر ایک طرف مسلمان اپنے قیمتی علمی ورثوں سے محروم رہے تو دوسری طرف چند ایک دردمندوں کے دلوں میں امید کی یہ چنگاری بھی سُلگ اٹھی کہ ہو سکتا ہے خدا نے اس عذاب کے پردہ میں مسلمانوں کی نجات کا سامان کیا ہو اور آئندہ کے لئے وہ ملائیت کے اس خود ساختہ مفسرین مذہب کے جال سے آزاد ہو کر قرآنی تعلیمات کی طرف رجوع کو اپنا شعار بنا لیں۔ لیکن ان کے یہ ارمان خاک میں مل گئے۔ کیونکہ سقوطِ بغداد کے کچھ عرصہ بعد جب منگولوں نے خود مذہب اسلام کو قبول کیا تو اسی طبقہ کے بچے کھچے افراد ان کی شہنشاہیت کو استحکام بخشنے اور ان کو ظل اللہ ثابت کرنے کے لئے پھر مطلع سیاست پر اُبھرے۔ ایک طرف اگر ذاتی اقتدار کے لئے انہوں نے اجتہاد کے سارے راستے مسدود کر کے دین کو ایک جامد اور زمانے کے ساتھ نہ چلنے والا ضابطہ بنایا تو دوسری طرف مستقل طور پر مسلمان کو مفلوج کرنے کے لئے سائنسی علوم کے حصول کے دروازے ان پر یہ کہہ کے بند کئے گئے کہ مسلمان کا تعلق صرف آخرت سے ہے دنیا سے نہیں۔ اور چونکہ دنیاوی علوم مسلمان کو اپنے اصلی مقصد سے غافل کرتے ہیں اس لئے ان کا حصول حرام ہے۔

نتیجہ واضح تھا۔ عالمِ اسلام کا اتحاد پارہ پارہ ہوا اور غیر اقوام کو موقع ملا کہ ایک ایک کر کے وہ تمام مسلمان ریاستوں پر قبضہ جما لیں۔ ملائیت کے منضبط نصاب کے مطابق تعلیم دینے والے مدارس ہر ملک میں لاتعداد موجود تھے۔ لیکن ان کے فارغ التحصیل آخرت کی تیاری کرنے والے طلبہ دشمن کو انہیں غلام بنانے سے نہ روک سکے۔ ان میں جہاد کا جذبہ مفقود تھا۔ اور اگر کہیں کہیں تھا بھی تو سائنسی علوم سے بے خبر ہونے کی بنا پر دشمن کے خلاف استعمال کرنے کے لئے ان کے پاس وہ اسلحہ نہیں تھا جو اُن کے اسلحہ کا جواب تھا۔

عیسائی کلیسائی نظام اور زرتشتی مخصوص طبقے کے اثرات کے علاوہ ہندوپاک کی فتح کے بعد برہمنوں کے مخصوص نظریات سے بھی ملائیت نے کافی استفادہ کیا۔ مثلاً اب عام مسلمانوں سے اعلیٰ وارفع مقام کا مالک بنا۔ جنت کی ٹھیکیداری اسی کے حصے میں آئی۔ اور اسی کی خوشنودی خدا کی خوشنودی قرار پائی۔

ملائیت نے اسلام کو جس حد تک نقصان پہنچایا ہے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ فرما چکے ہیں۔ کہ ؎

دینِ حق از کافری رسواتر است
زانکہ ملا مومن کافر گر است


## طلوعِ اسلام کی کتابیں اور ماہنامہ طلوعِ اسلام
## یہاں سے بھی مل سکتے ہیں

**لاہور:** (۱) انٹرنیشنل بک سروس ... ۷۵ دی مال لاہور
(۲) کلاسیک بکسیلرز .. .. ۴۲ دی مال "
(۳) پیپلز پبلشنگ ہاؤس .. .. ۲۶ دی مال "
(۴) کواپریٹو بک شاپ .. .. ۷ دی مال "
(۵) لاہور بک ڈپو .. .. ۶۵ دی مال "
(۶) بک سنٹر .. .. چوک ریگل دی مال "
(۷) ادبستان .. .. چوک لکشمی دی مال "
(۸) آئیڈیل بک ہاؤس .. .. ۱۹۴ انارکلی "
(۹) مکتبۂ پاکستان .. .. چوک انارکلی "
(۱۰) گوشۂ ادب .. .. چوک انارکلی "
(۱۱) اسمٰعیل اینڈ برادرز .. .. چوک انارکلی "
(۱۲) نیشنل بک سٹال .. .. چوک انارکلی "
(۱۳) ماڈل بک سٹال .. .. ٹولنٹن مارکیٹ دی مال "
(۱۴) اوریگا بک سٹال .. .. گلبرگ ۲ لاہور
(۱۵) پیپلز پبلشنگ ہاؤس .. .. المنار مارکیٹ چوک انارکلی۔ لاہور۔
(۱۶) قریشی فوٹوگرافرز۔ قاسم بلڈنگ مین بازار۔ لاہور چھاؤنی

**کراچی:** (۱) محترم محمد اسلام صاحب (۴-۱۰۰) تونیس روڈ نیو ٹاؤن۔ کراچی ۵
(۲) ہر اتوار کی صبح۔ ۹ بجے تا ۱۲ بجے سندھ اسمبلی ہال۔ بندر روڈ۔
(۳) گلڈز انجمن کتاب گھر۔ وکٹوریہ روڈ۔ صدر
(۴) عوامی کتب خانہ۔ بولٹن مارکیٹ۔
(۵) شیخ شوکت علی اینڈ سنز بندر روڈ کراچی۔
(۶) جنرل بک ڈپو۔ فریئر روڈ۔ نزد حبیب بنک کراچی۔
(۷) اقبال کتاب گھر ہمرسٹ سٹریٹ۔ کراچی صدر۔

**انگلستان:** محترم رشید احمد بٹ صاحب۔ ۱۶۰ سالٹ سٹریٹ۔ بریڈ فورڈ ۸

# نقد و نظر

## لغات طب

بعض کتابیں ایسی بھی سامنے آجاتی ہیں جنہیں دیکھ کر مصنف (یا مؤلف) کی محنت و کاوش اور دیدہ ریزی و جگر سوزی کی بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب ایسی ہی ہے۔ آجکل ہمارے ہاں اس سوال نے بڑی اہمیت اختیار کر رکھی ہے کہ ہمیں انگریزی زبان کی جگہ اُردو اپنے ہاں ہر شعبہ میں رائج کرنا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسانی علوم نے جس حد تک ترقی کر لی ہے ہم اپنی زبان کو اس کے ہمدوش کر لیں۔ اس سلسلہ میں اصطلاحات کا مسئلہ خاصا وقت طلب ہے۔ اور ان اصطلاحات میں، ایلوپیتھی کی فنی اصطلاحات (ادویوں اور بیماریوں کے ناموں) کے مترادفات تلاش یا وضع کرنا، اور بھی مشکل۔ حکیم غلام نبی (ایم۔ اے) نے اس کوہ کنی کو اپنے ذمہ لیا اور جوئے شیر لانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس متوسط سائز کی ۵۰۸ صفحات (دو کالمی) کتاب میں، ایلوپیتھی کی اصطلاحات کا ترجمہ، نہایت عمدہ ٹائپ میں چھپا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ اردو میں تو ہو نہیں سکتا تھا اس لئے اسے عربی ترجمہ ہی سمجھئے۔ اہل فن کے لئے حکیم صاحب کی یہ محنت یقیناً مفید ثابت ہوگی۔ کتاب، مغربی پاکستان، اردو اکادمی، لاہور، کی زیر نگرانی، اور اکادمی، بہاولپور، کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ مجلد کی قیمت بیس روپے ہے جو کتاب کی صوری اور معنوی خوبیوں کے پیش نظر قطعاً زیادہ نہیں۔

## PAKISTAN FACES INDIA

محترم عزیز بیگ صاحب، ایک تجربہ کار صحافی اور ملک کے مشہور اہل قلم ہیں۔ یوں تو وہ میدان سیاست کے جس گوشے کی طرف نکلتے ہیں، ہمارے لئے پُر از معلومات تحائف لاتے ہیں لیکن جہاں تک ہندو سیاست کا تعلق ہے، اس میں وہ خوب کھل کھیلتے ہیں۔ زیر نظر کتاب اس کا ایک خاص نمونہ ہے۔ اس میں ہندوستان اور پاکستان کے تصادم، ہندی سیاست کی چیرہ دستیوں اور ہندو ذہنیت کی بڑی چابک دستی سے بے نقاب کیا گیا ہے۔ کتاب عمدہ ٹائپ میں چھپی ہے اور "بابر اینڈ عامر پبلیکیشنز (4-N) گلبرگ انڈسٹریل ایریا۔ لاہور، کی طرف سے حسن اہتمام کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ کتاب پر قیمت درج نہیں۔

# ادارۂ طلوعِ اسلام کی بصیرت افروز مطبوعات

۱۔ **انسان نے کیا سوچا؟** افلاطونِ اعظم سے لیکر اب تک گزشتہ ساڑھے تین ہزار سالوں میں فکرِ انسانی کن مراحل میں بھٹکتی ہوئی کہاں سے کہاں تک پہنچی۔ مفکرینِ عالم کی ہزاروں کتابوں کا لبِ لباب۔ قیمت۔ ۱۲ روپے۔

۲۔ **اسلام کیا ہے؟** اسلام کے درخشندہ حقائق کا حقیقت کشا مرقع۔ مفکرِ قرآن کی بصیرتِ قرآنی کا بصیرت آفریں شاہکار۔ قیمت اعلیٰ ایڈیشن۔ آٹھ روپے۔ سستا ایڈیشن چار روپے۔

۳۔ **من و یزدان**۔ خدا کیا ہے؟ اسے ماننا کیوں ضروری ہے؟ نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے اور ماننے سے کیا کچھ حاصل ہوتا ہے؟ ذہنِ انسانی میں ابھرتے ہوئے ان بنیادی سوالات کا جواب قرآنِ کریم کی روشنی میں۔ قیمت۔ دس روپے۔

۴۔ **ابلیس و آدم**۔ آدم۔ ملائکہ۔ وحی۔ ابلیس، شیطان، جنّ ۔۔۔ ان سب کی حقیقت قرآنِ کریم کی رُو سے کیا ہے؟ یہ حقائق اسی کتاب کے مطالعہ سے سامنے آسکتے ہیں۔ قیمت۔ آٹھ روپے

۵۔ **سلیم کے نام خطوط** (تین جلدوں میں)۔ ہماری نئی نسل کے ذہنوں کو کس قسم کے سوالات طلسمِ پیچ و تاب بنائے ہوئے ہیں اور فکرِ قرآنی کس حسین انداز سے انہیں روشنی میں لاکر شادابیٔ قلب و نگاہ کا سامان پیدا کرتی ہے۔ اسے علیٰ وجہ البصیرت سمجھنے کے لئے ان کا مطالعہ ضروری ہے۔ قیمت جلد اول۔ آٹھ روپے۔ جلد دوم سوم۔ چھ چھ روپے۔

۶۔ **سلسبیل**۔ پرویز صاحب کے علم افروز مقالات اور حقیقت کشا خطابات و تشریحات کا مجموعہ۔ قیمت ۸ روپے۔

۷۔ **بہارِ نو**۔ انہیں مقالات اور خطابات کا دوسرا مجموعہ۔ سستا ایڈیشن۔ قیمت ۵ روپے

۸۔ **اسبابِ زوالِ امت**۔ عروج و اقبال کے مقاماتِ بلند سے محروم ہو کر ہم زوال اور شکست کی موجودہ پستی تک کیوں پہنچے؟ اس اہم اور تاریخی سوال کا جواب قرآنِ کریم کی بارگاہِ عالی سے۔ قیمت۔ ڈیڑھ روپیہ۔

۹۔ **اسلامی معاشرت**۔ روزمرہ کی زندگی کے اہم مسائل کی تفصیل قرآنی تعلیمات کی روشنی میں۔ قیمت دو روپے

## اسی سلسلۂ بصیرت افروز کی مزید کڑیاں

مقامِ حدیث۔ چار روپے، برقِ طور۔ چھ روپے، شعاعِ مستور۔ چھ روپے، فجر الاسلام۔ آٹھ روپے الفتنۃ الکبریٰ۔ چھ روپے۔ **لغات القرآن**۔ جلد اول۔ دوم۔ سوم۔ پندرہ پندرہ روپے میں۔ جلد چہارم۔ بارہ روپے۔ (مکمل سیٹ۔ پچاس روپے میں)

شائع کردہ

**ادارۂ طلوعِ اسلام۔ ۲۵۔ بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور**

(جملہ حقوق محفوظ)

# مطالب الفرقان

## قرآن مجید کے آخری پارہ کا تشریحی ترجمہ

قارئین کی طرف سے، ایک مدت سے اصرار ہوتا چلا آرہا ہے کہ طلوع اسلام میں قرآن مجید کا تشریحی ترجمہ سلسلہ وار شروع کیا جائے۔ ہمارے لئے یہ تجویز بہ وجوہ قابلِ عمل نہیں تھی اس لئے ہم قارئین کے اس تقاضا کو پورا کرنے سے قاصر رہے۔ اب اس اصرار کے حق میں دلائل میں ایک اور دلیل کا اضافہ ہوا ہے کہا یہ گیا ہے کہ قرآن مجید کے آخری پارہ کی سورتیں اسکولوں کے نصاب میں داخل کی گئی ہیں۔ اس پارہ کے مطالب بہت مشکل ہیں اور اساتذہ ان سورتوں کو خود ہی اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے، چہ جائیکہ وہ پوچھنے والے طالب علموں کو سمجھا سکیں۔ اس لئے کم از کم اس پارہ کے مطالب طلوع اسلام میں بیان کر دیئے جائیں۔ اس تقاضا کے پیش نظر ہم اس پارہ کے تشریحی ترجمہ کا سلسلہ شروع کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ ہم آزمائشی طور پر شروع کر رہے ہیں۔ اگر اس کا تقاضا بدستور رہا اور عدم گنجائش مانع نہ ہوئی تو ہو سکتا ہے کہ اسے اور بھی آگے بڑھا دیا جائے۔

(۲) قرآن مجید کی ترتیب کا انداز نصابی کتابوں کا سا ہے۔ شروع میں حقائق کم ہیں اور انہیں ذہن نشین کرانے کے لئے تفاصیل زیادہ۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جاتے ہیں، حقائق زیادہ ہوتے جاتے ہیں، اور تفصیلات کم۔ حتیٰ کہ آخری پاروں میں کم از کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ حقائق کو سمو دیا گیا ہے۔ (یہ وجہ ہے کہ آخری پارے زیادہ مشکل نظر آتے ہیں)

(۳) قرآنِ مجید میں تین قسم کے انقلابات کا ذکر آتا ہے۔ ایک انقلاب خارجی کائنات کا ہے جس میں اس قسم کے طبیعی حوادث پیدا ہوں گے جن سے یہ سارا سلسلہ درہم برہم ہو جائے گا۔ دوسرا انقلاب اقوام کی زندگی سے متعلق ہے۔ اور تیسرا انقلاب وہ ہے جس کا تعلق موت کے بعد کی زندگی سے ہے۔

قرآن مجید (بالخصوص اس کے آخری پاروں) میں ان انقلابات کا تفصیلی تذکرہ آیا ہے. لیکن اس میں (بالعموم) اس امر کی تخصیص نہیں کی گئی کہ فلاں واقعہ کا تعلق کون سے انقلاب سے ہے. اسے اس نے ہمارے غور و تدبّر پر چھوڑ دیا ہے. اس سلسلہ میں جو الفاظ قرآن مجید میں آتے ہیں اُن کے اگر لغوی معانی لئے جائیں تو اُن کا اطلاق خارجی کائنات سے متعلق حوادث پر ہوتا ہے، لیکن اگر ان کے مجازی معانی لئے جائیں تو ان سے اقوامِ عالم کے داخلی انقلابات یا حیاتِ آخرت کے کوائف کا تصور سامنے آتا ہے. ہم نے زیرِ نظر ترجمہ میں ان الفاظ کے مجازی معانی لئے ہیں اور انہی کی روشنی میں ان آیات کے مطالب متعین کئے ہیں. اگر کوئی صاحب ان الفاظ کے لغوی معنی لینا چاہیں تو وہ قرآن مجید کا کوئی سا مروجہ ترجمہ سامنے رکھ لیں، یا پرویز صاحب کی لغات القرآن دیکھ لیں جس میں الفاظِ قرآنی کے لُغوی اور مجازی دونوں معنی دیئے گئے ہیں. ہم اپنے پیش کردہ مطالب کے ضمن میں، کسی سے کسی قسم کی بحث میں نہیں اُلجھیں گے. قلّتِ گنجائش کی بنا پر آیات کا متن نہیں دیا گیا. اسے آپ خود قرآن مجید کے کسی نسخے سے دیکھ لیں. آیات کا نمبر دیا گیا ہے تشریح میں جہاں دیگر آیات کے حوالے آتے ہیں اُن سے مطلب یہ ہے کہ وہی مضمون اِن دیگر مقامات پر بھی آیا ہے.

---

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

# پارہ عَمَّ (۳۰) ★ سُورۃ النّبا (۷۸)

(۱) (اے رسولؐ! تمہیں معلوم ہے کہ) یہ لوگ، ایک دوسرے سے کسی چیز کے متعلق دریافت کرتے ہیں؛
(۲-۳) یہ دریافت کرتے ہیں اُس عظیم واقعہ کے متعلق، جس کی بابت اُن کے خیالات مختلف ہیں. کوئی کچھ کہتا ہے... کوئی کچھ.
(۴) لیکن ان کی یہ تذبذب اور اختلاف کی کیفیت زیادہ عرصہ تک نہیں رہے گی. انہیں ان کے متعلق جلد معلوم ہو جائے گا.
(۵) پھر سن لیجئے کہ یہ حتمی اور یقینی بات ہے کہ انہیں اسکے متعلق جلد معلوم ہو جائے گا.
(۶) ان سے کہو کہ (اُس آنے والے انقلاب کو سمجھنے کے لئے، ذرا نظامِ کائنات پر غور کریں اور دیکھیں کہ اس میں ہمارا قانون کس حسن و خوبی سے کارفرما ہے. سب سے پہلے، یہ ذرا) اس زمین پر نگاہ ڈالیں

جس میں یہ بستے ہیں۔ (یہ گول ہے اور نہایت تیزی سے گھوم رہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود) ہم نے اسے ان کے لئے گہوارۂ آسائش بنا دیا ہے۔

(۷) اور پہاڑوں کو اس قدر محکم گویا وہ میخیں گڑی ہوتی ہیں۔

(۸)۔ (پھر ان سے کہو کہ تم اس خارجی کائنات سے ہٹ کر اپنی دنیا کی طرف آؤ اور دیکھو کہ) ہم نے تمہیں کس طرح جوڑے جوڑے پیدا کیا ہے۔ یعنی نر اور مادہ، جن سے تمہاری نسل کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔ اور ایک سے دوسرے کی تکمیل ہوتی ہے۔

(۹-۱۱)۔ پھر رات اور دن کے تغیرات پر غور کرو۔ دن میں تم تلاشِ معاش (کاروبار) کرتے ہو۔ اس سے تھک جاتے ہو، تو رات کی تاریکی ایک بسیط چادر بن کر فضا پر چھا جاتی ہے، اور تم اس میں چین کی نیند سوتے ہو۔ اس طرح، تمہاری صَرف شدہ توانائیاں، لوٹ آتی ہیں اور تم، دوسرے دن پھر کام کاج کیلئے قابل ہو جاتے ہو۔

(۱۲) اور تمہارے سر پر فضا کی پہنائیوں میں کیسے محکم اور مضبوط، متعدد کُرّے بنا دیئے۔

(۱۳) ان میں ذرا اُس جگمگاتے چراغ کو دیکھو جسے سورج کہا جاتا ہے۔ اسے ہم نے کس طرح، بیک وقت روشنی اور حرارت کا سرچشمہ بنا دیا ہے۔

(۱۴) اور اُن بادلوں کو دیکھو۔ ہم ان سے کس طرح موسلا دھار بارش برساتے ہیں۔

(۱۵) تاکہ اس سے مختلف قسم کی فصلیں پیدا ہوں ــــ اناج کی فصلیں اور سبزیاں، ترکاریاں۔

(۱۶) نیز گھنے باغات۔

(۱۷)۔ (جب تم دیکھ رہے ہو کہ خارجی کائنات میں ہمارے قوانین کس طرح ٹھیک ٹھیک کام کر رہے ہیں، اور کس طرح گیہوں سے گیہوں، اور جَو سے جَو پیدا ہوتا ہے تو اس سے تمہیں یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ خود تمہاری دنیا میں بھی ہمارا قانونِ مکافات اسی طرح کارفرما ہے۔ لہٰذا) یہ یقینی بات ہے کہ وہ انقلاب، جو تمام امور کو نکھار کر الگ الگ کر دے گا۔ جسے فصل کاٹنے کا دن سمجھو، وہ واقع ہو کر رہے گا۔ جس طرح فصل کے پکنے کا ایک وقت معین ہوتا ہے، اسی طرح اس کی بھی ایک مُدت مقرر ہوتی ہے۔ وہ اپنے وقت پر ضرور آئے گا۔

(۱۸) جس دن (جنگ کا) بگل بجے گا۔ اور تم فوج در فوج میدانِ کارزار میں آؤ گے[1]

---

[1] یہاں سے آخر تک وہ انقلاب بھی مراد ہو سکتا ہے جسے رسول اللہ کے مخالفین نے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لیا۔ اور وہ بھی جو مرنے کے بعد انسان کے سامنے آئے گا۔

(۱۹) ۔ اور ان جاہ و حشمت کی مالک جماعتوں کی سربلندیاں، کھلے ہوئے پھاٹک کی طرح چوپٹ ہو جائینگی۔ (یا فضائی کرّے پھٹ جائینگے۔)

(۲۰) اور پہاڑوں جیسے مستحکم سردارانِ قوم کے پاؤں اکھڑ جائینگے؛ اور وہ بالکل بے حقیقت ہو کر رہ جائینگے۔ (یا پہاڑ اُڑا دیئے جائینگے۔)۔ (۲۰؍۵۵ ؛ ۱۸؍۱۰۵ ؛ ۱۰؍۷۷ ؛ ۲؍۵۶ ؛ ۱۴؍۷۳)

(۲۱ - ۲۲) اور جہنم ان سرکشوں کی گھات میں ہے۔ وہی ان کا ٹھکانا ہوگا۔

(۲۳) وہ اس میں زمانہ دراز تک رہیں گے۔

(۲۴) اس میں، وہ راحت و آرام نہیں پائیں گے۔ حتیٰ کہ پینے کی بھی کوئی ایسی چیز نہیں ملے گی جس سے سکون حاصل ہو۔

(۲۵) اس کے بجائے، انہیں یا تو کھولتا ہوا پانی ملے گا جو پیاس بجھانے کے بجائے اسے اور بھڑکائے؛ اور یا ایسا یخ بستہ، جس کی ٹھنڈک سُن کر دے۔ (یہ دونوں، انسانی امیدوں کی کھیتی کو جھلسا دینگے۔ ۳۰؍۵۶)

(۲۶) اور یہ سب ان کے اپنے اعمال کا بدلہ ہوگا ــ ٹھیک ٹھیک بدلہ۔

(۲۷) یہ لوگ ہمارے قانونِ مکافات پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ انہیں توقع ہی نہیں تھی کہ جو کچھ وہ کرتے ہیں، انہیں اسکا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔

(۲۸) اسی لئے وہ ہمارے قوانین کو بُری طرح جھٹلاتے تھے۔

(۲۹) لیکن ہم ان کے ہر عمل کو محفوظ کئے جاتے تھے۔ (اور انہیں واضح طور پر متنبہ کر دیا گیا تھا۔ کہ ان اعمال کے نتائج تمہارے سامنے آ کر رہیں گے)

(۳۰) اس لئے (ان سے کہا جائیگا کہ، تم آج اپنے اعمال کا مزہ چکھو۔ یہ عذاب، کم ہونے کے بجائے بڑھتا ہی چلا جائے گا۔

(۳۱) ان کے برعکس، جو لوگ قوانین خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں، ان کے لئے ہر قسم کی کامیابی و کامرانی ہے۔

(۳۲) باغات رہنے کو۔ انگوروں (جیسے پھل) کھانے کو۔

(۳۳) اور بیگمات، تندرست و توانا، شرف و مجد کی پیکر، ان میں حسد اور رقابت کے جذبات نہیں ہوں گے۔ وہ ہم مزاج اور ہم کُل ہونگی۔ اُس معاشرہ میں، میاں بیوی کے تعلقات بھی کامل ہم آہنگی اور یک گلی کے ہونگے۔ (۳۷؍۵۶)

(۳۴) اور (حیات بخش توانائیوں کا) پاک اور صاف، لبالب، چھلکتا ہوا پیالہ (جو بھرپور اور

پاکیزہ زندگی کا ضامن ہوگا۔)

(۳۵) اس میں نہ کوئی بے معنی بات ہوگی، نہ غلط اور جھوٹی گفتگو۔

(۳۶) یہ سب، تیرے نشوونما دینے والے کی طرف سے ان کے اعمال کا نتیجہ ہوگا۔ اور ان کی ہر ضرورت کے لئے کافی۔

(۳۷) اُس نشوونما دینے والے کی طرف سے جس نے کائنات کی ہر شے کے لئے سامانِ زیست عطا کر رکھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ صاحب اقتدار ایسا ہے کہ کائنات کی کسی شے کو اِس کی مجال نہیں کہ وہ اُس کے کسی کام میں دخل دے سکے، یا اس سے بازپرس کر سکے۔

(۳۸) اُس دَور میں (یعنی ظہورِ نتائج کے وقت) الوہیاتی توانائی (جو عالم امر میں کارفرما ہے)، اور کائناتی قوتیں (جو عالمِ خلق میں سرگرمِ عمل ہیں)، صف بستہ کھڑی ہونگی (تاکہ وہ انسانی اعمال کے نتائج سامنے لائیں)، اور کسی کو یارائے تکلم نہ ہوگا۔ (بات کرنے کی مجال نہیں ہوگی)، بجز اس کے کہ وہ، خدائے رحمٰن کے مقرر کردہ قاعدے کے مطابق درست بات کہے۔

(۳۹) یہ دَور ایک حقیقتِ ثابتہ ہے، جس کے واقع ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ لہٰذا ابھی وقت ہے کہ جس کا جی چاہے خدا کے نظامِ ربوبیت کو اپنا نصب العین قرار دیکر، اس کی طرف قدم بڑھائے

(۴۰) ہم تمہیں آگاہ کئے دیتے ہیں کہ (اگر تم نے یہ راہ اختیار نہ کی تو) تم پر بہت جلد تباہی آجائے گی اُس وقت انسان اپنے اعمال کے نتائج اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لے گا۔ اور جو شخص اِس وقت اس کے واقع ہونے سے انکار کرتا ہے وہ (اس تباہی کو دیکھ کر) بصد حسرت و یاس پکار اُٹھے گا کہ اے کاش! یہ زندگی اور شعور، احساس اور ذمہ داری کا حامل انسان ہونے کے بجائے، مٹی کا تودہ ہوتا (تو اس عذاب سے بچ جاتا۔ لیکن اُس وقت اِس تاسف سے کیا ہوگا!)

# سُورۃ النّازعات (۷۹)

(۱) مستبد قوتیں، زیردست طبقہ کو اس قدر کچلتی ہیں کہ ان کی ساری توانائیاں اور صلاحیتیں دب کر رہ جاتی ہیں اور وہ بالکل بنجر زمین کی طرح نظر آتے ہیں جس میں زندگی کی کوئی علامت باقی نہ رہے۔ لیکن قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے ایسی انقلابی جماعت پیدا ہو جاتی ہے جو اس مظلوم و مقہور طبقہ کی

دبی ہوئی صلاحیتوں کو پورے زور سے کھینچکر اوپر لے آتی ہے۔

(۴) اور مستبد طبقہ نے، ان کی راہ میں جس قدر رکاوٹیں ڈال رکھی ہوتی ہیں، وہ جماعت ان سب کو راستے سے ہٹاکر، کمزور طبقہ کی غلامی کی گرہیں کھول دیتی ہے کہ وہ آزادانہ سرگرم عمل ہوں۔

(۳۔۴) اس طرح، وہ (کمزور طبقہ) حرکت و عمل کے سمندر میں تیزی سے تیرتا ہوا، آگے بڑھتا جاتا ہے اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہتی۔

(۵) تاآنکہ زمام اقتدار، مستبد قوتوں سے چھن کر، ان کمزوروں کے ہاتھ میں آجاتی ہے۔ اور وہ اپنے تمام معاملات کی تدبیر، قوانینِ خداوندی کی روشنی میں، خود آپ کرتے ہیں۔

(۶۔۷) یہ انقلاب آفریں جماعتِ مومنین، جو زیردستوں کو ابھار کر اوپر لا رہی ہے، اس حقیقت پر شاہد ہے کہ یہ آنے والا انقلاب آکر رہے گا۔ اس انقلاب میں جھٹکے پر جھٹکا آئے گا، اور ہر جھٹکے سے، نیچے کا طبقہ ابھر کر اوپر آجائے گا، اور اوپر والا طبقہ نیچے چلا جائے گا۔

(۸) اس دن، ان سرکش اکابرین کے دل تیزی سے دھڑک رہے ہونگے۔ یہ سخت اضطراب میں مبتلا ہوں گے۔

(۹) اور (شکست و نامرادی کے احساس سے) ان کی نگاہیں ندامت سے جھکی ہوئی ہونگی۔

(۱۰) (اِس وقت اِن کے غرور کا یہ عالم ہے کہ جب ان سے "قانون مکافات" کا ذکر کیا جاتا ہے، تو یہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ذرا ان کی سنیئے۔ یہ کہہ رہے ہیں کہ) یہ تمام قوت و دولت اور جاہ و حشمت، جسے تم نے کمزوروں سے چھین رکھا ہے، سلب کرلی جائے گی اور تم پھر اُسی حالت میں پہنچ جاؤ گے جہاں تم اس جاہ و حشمت سے پہلے تھے۔

(۱۱) اور تم کھوکھلی ہڈیاں رہ جاؤ گے۔[1]

(۱۲) کہتے ہیں کہ اگر ایسا ہوگیا، اور ہم پھر پہلی حالت میں پہنچ گئے، تو یہ گردش بہت بُری ہوگی، اس میں تو ہم سراسر نقصان میں رہیں گے۔ (وہ ایسی باتیں طنزاً کرتے ہیں)

(۱۳۔۱۴) ان سے کہو کہ ایسا کرنا ہمارے لئے ذرا بھی مشکل نہیں۔ وہ ایک سخت آواز ہوگی اور اسکے

---

[1] ان آیات میں، مرنے کے بعد دوبارہ زندگی بھی مراد لی جاسکتی ہے۔ لیکن چونکہ آیت ۱۵ سے اس انقلاب کا ذکر شروع ہوتا ہے جو حضرت موسیٰ، اور فرعون کی کشمکش کی صورت میں رونما ہوا تھا، اس لئے ہم نے اسی دنیا میں سامنے آنے والے انقلاب کے مفہوم کو ترجیح دی ہے۔

بعد سب میدان میں ہونگے۔ (اُسی میدانِ جنگ میں یہ سب فیصلے ہو جائینگے)

(۱۵) (یہ انقلاب کوئی نیا انقلاب نہیں ہوگا۔ یہ سلسلہ تو شروع سے چلا آرہا ہے۔ مستبد قوتیں کمزوروں کو دباتی رہی ہیں، اور انبیاء کرام اور اُن کے رفقاء کی جماعتیں، ان کمزوروں اور ناتوانوں کو ابھار کر اوپر لاتی رہی ہیں۔ مثلاً) موسےٰؑ اور فرعون کی کشمکش کو لو۔

(۱۶) اس داستان کا آغاز اس جگہ سے کرو جب موسےٰؑ، اس مقام میں پہنچ چکا تھا جہاں عقل کے تجرباتی طریق کی لمبی مسافتوں کو لپیٹ کر رکھ دیا گیا تھا۔ اور اس پر وحی کے ذریعے براہ راست انکشافِ حقائق کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ (۲۰/۱۲ یعنے جب موسےٰؑ کو نبوت سے سرفراز کیا گیا تھا، اس وقت، اُسکے نشو ونما دینے والے نے اسے پکارا، اور کہا کہ)

(۱۷) تم فرعون کی طرف جاؤ۔ اس نے دھاندلی مچا رکھی ہے۔ وہ بڑا ہی سرکش ہو گیا ہے۔ اُس نے کمزوروں کو بُری طرح..... دبا رکھا ہے۔

(۱۸) اس کی طرف جاؤ اور اس سے کہو کہ (تم نے دولت اور قوت تو بہت جمع کر رکھی ہے لیکن اپنے مقامِ انسانیت کے متعلق تم نے کبھی کچھ سوچا ہی نہیں) کیا تو چاہتا ہے کہ تیرے شرفِ انسانیت کی بھی نشو ونما ہو جائے؟

(۱۹) اور میں تجھے وہ راستہ بتاؤں جو خدا کی ربوبیتِ عامہ کی طرف لے جائے — اُس سے یہ کچھ کہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے اُس کا احساس بیدار ہو جائے اور وہ اپنی موجودہ روش سے، جو اسے تباہیوں کے جہنم کی طرف لئے جا رہی ہے، رُک جائے۔ (اس سے کم از کم اتمامِ حجت ہی ہو جائے گا)

(۲۰) موسےٰؑ اس کی طرف گیا اور قوانینِ خداوندی کا وہ ضابطہ اس کے سامنے پیش کیا جس سے اس قسم کا انقلاب برپا ہونا تھا۔ (۲۰/۴۴)

(۲۱) لیکن فرعون نے اس کی تکذیب کی اور بدستور اپنی سرکشی پر اڑا رہا۔

(۲۲) اور موسےٰؑ کی طرف سے منہ پھیر کر الٹا اس کوشش میں لگ گیا کہ اُسے کسی طرح شکست دے دی جائے۔

(۲۳) چنانچہ اس مقصد کے لئے اس نے اپنی مملکت کے عمائد و اراکین کو جمع کیا۔

(۲۴) اور ان سے کہا کہ تمہاری پرورش میں کرتا ہوں (کھانے پینے کو میں دیتا ہوں۔ میں ہی تمہارا "اَن داتا" ہوں) اس لئے تمہارا سب سے بڑا نشو ونما دینے والا میں ہی ہوں۔ (یہ جو موسےٰؑ کہتا ہے کہ تمہارا نشو ونما دینے والا خدا ہے، یہ غلط ہے)

(۲۵)۔ (جب اس نے اس طرح اپنی سرکشی میں انتہا کر دی تو) خدا کے قانونِ مکافات نے اسے اس طرح پکڑا کہ اس کا حال بھی تباہ ہو گیا اور مستقبل بھی برباد ــــ یہ نتیجہ تھا اس کے ان جرائم کا جو اس نے موسیٰؑ کی آمد سے پہلے کئے تھے اور جن کا مرتکب وہ اس کی آمد کے بعد بھی ہوتا رہا۔

(۲۶) موسیٰؑ اور فرعون کی کشمکش کے اس تاریخی نوشتے میں ہر اس شخص اور قوم کے لئے سامانِ عبرت ہے جو خدا کے قانونِ مکافات کی گرفت سے ڈرے۔

(۲۷) اے رسولؐ! تم اپنی قوم کے سامنے یہ تاریخی شہادتیں پیش کرنے کے بعد' ایک دفعہ ان سے پھر کہو کہ تم سلسلۂ کائنات اور خود اپنی پیدائش پر غور کرو۔ اور بتاؤ کہ (پیدائش کے اعتبار سے تم زیادہ سخت اور مستحکم ہو یا یہ فضائی کرّے جنہیں ہم نے بنایا ہے۔

(۲۸) خدا نے ان عظیم کروں کو فضا کی بلندیوں میں پیدا کیا۔ اور پھر ان میں ایسا اعتدال اور توازن رکھ دیا کہ وہ اپنے اپنے مقام میں نہایت استحکام کے ساتھ سرگرمِ عمل ہیں۔

(۲۹) پھر اسی فضا میں رات کو تاریک بنایا اور دن کے وقت اُس کی روشنی کو نمودار کیا۔

(۳۰) پھر اس زمین کو دیکھو۔ یہ اور دیگر اجرام پہلے ایک ہی ہیولیٰ تھے۔ اُس نے اِس ہیولیٰ سے ارض (زمین) کو الگ کر کے یوں دور پھینک دیا جس طرح گوپئے سے پتھر پھینکا جاتا ہے۔[1] (۷۹/۳۰)

(۳۱) اس کے بعد اس میں سے پانی نکال کر سمندروں کو الگ کیا۔ (اور خشکی کے قطعات کو الگ) پھر ان قطعات میں نباتات کی نمود ہوئی۔

(۳۲) اور انہی میں بڑے بڑے محکم پہاڑوں کو اُبھارا۔

(۳۳) اور اس تمام سلسلہ کو اس انداز سے استوار کیا کہ یہ تمہارے اور تمہارے مویشیوں کے لئے سامانِ زیست پیدا کرے۔ (زمین' رزق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس سے تمتع یعنے فائدہ حاصل ..... کیا جا سکتا ہے، ملکیت نہیں بنائی جا سکتی)۔

(۳۴)۔ (لیکن اگر انسانی معاشرہ ایسا قائم ہو جائے کہ اس میں زمین کی پیداوار انسانوں کے لئے زیست کا سامان بننے کے بجائے' دولت و قوت حاصل کرنے کا ذریعہ بن جائے' تو) پھر وہ انقلابِ عظیم

---

[1] آیت (۷۹/۳۰) میں ثُمَّ ترتیب کے لئے نہیں۔ اجرامِ فلکی کی تخلیقی ترتیب یہی ہے جو یہاں بیان ہوئی ہے۔ عصرِ حاضر کا علمی انکشاف یہ ہے کہ اولین ہیولیٰ (NEBULA) کی تیز گردش سے جو چھینٹے اڑے وہ ان کروں کی شکل میں گردش کر رہے ہیں۔ اس سے قرآنی مثال کا مفہوم سمجھ میں آ سکتا ہے۔

آجائے گا (جس کا ذکر شروع کی آیات میں کیا گیا ہے)

(۳۵) اُس وقت ہر انسان دیکھ لے گا کہ اُس نے محنت کس قدر کی تھی۔ کیونکہ ہر شخص کو اس کی اپنی محنت کا معاوضہ ملے گا۔ وہ دوسروں کی محنت کو غصب نہیں کر سکے گا، نہ ہی کسی کی محنت رائیگاں جائیگی۔ (۵۳/۳۹ ؛ ۵۶/۷۳-۹۳)

(۳۶) اُس وقت جہنم اُبھر کر سامنے آجائے گا۔ لیکن صرف دیدۂ بینا کے لئے۔ یعنی اُس کے لئے جس میں حقائق کے مشاہدہ کی صلاحیت ہو۔ (۹۲/۱۴ ؛ ۳۹/۴۸ ؛ ۲۹/۵۴)۔ (یہ جہنمی زندگی دوسروں کی محنت کو غصب کرنے والوں کے لئے ہوگی)

(۳۷) یاد رکھو! جو شخص ہمارے قوانینِ ربوبیت سے سرکشی برتتا ہے۔

(۳۸) اور طبیعی زندگی کے پیش پا افتادہ مفاد کو مستقبل کی خوشگواریوں پر ترجیح دیتا ہے۔

(۳۹) تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا — وہ مقام جس میں انسانیت کی نشوونما رک جاتی ہے

(۴۰) لیکن جو شخص اس بات کا احساس رکھتا ہے کہ اس نے ایک دن عدالتِ خداوندی میں کھڑے ہونا ہے۔ یعنی اس کے اعمال کے نتائج اس کے سامنے آنے ہیں اور اس احساس کے ماتحت، وہ اپنے ان جذبات اور خواہشات کو بیباک ہونے سے روکتا ہے جو قوانین خداوندی کیخلاف جاتیں،

(۴۱) تو یہ وہ ہے جس کا مقام جنت ہے — اِس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

(۴۲) (اس انقلاب کے متعلق، یہ کچھ سننے کے بعد) یہ لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ یہ انقلاب بالآخر آئے گا کب؟

(۴۳) اے رسول! ان سے کہدو کہ اس کا وقت بتانے سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کب واقع ہوگا۔ (۷/۱۸۷ ؛ ۳۳/۶۳ ؛ ۴۲/۱۷)

(۴۴) اس کے وقت کا تعین، صرف خدا سے متعلق ہے۔ اُسی کو اس کا علم ہے۔ یہ تمام باتیں، انجام کار، اُس کے قانونِ مشیت کے مطابق طے ہوں گی۔ (۵۳/۴۲)

(۴۵) میرا فریضہ صرف یہ ہے کہ جو شخص خدا کے قانونِ مکافات کا احساس رکھتا ہے اور زندگی کی تباہیوں سے ڈرتا ہے، اسے بتا دوں کہ غلط روش کا نتیجہ کیا ہوگا۔

(۴۶) اِس وقت یہ اُس انقلاب کے لئے اس قدر جلدی مچا رہے ہیں لیکن جب وہ سر پہ آگیا تو یہ شکایت کریں گے کہ ہمیں مہلت کا دفعہ بہت کم ملا — یونہی ایک صبح یا ایک شام جتنا — (اگر زیادہ وقت ملتا تو ہم اپنی روش بدل لیتے!) لیکن اُس وقت اس شکایت یا تاسف سے کیا حاصل ہوگا؟

———

# سُورۃ عبس ۔ (۸۰)

(۱ - ۲) ۔ (نظام خداوندی کے قیام کے سلسلہ میں جس جماعتی تشکیل کے متعلق پہلے کہا گیا ہے، اس ضمن میں ایک اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ اور وہ یہ کہ، یہ نہیں دیکھنا چاہیئے کہ اس میں شامل ہونے والے کس قدر دنیاوی وجاہت و مناصب کے مالک ہیں۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس کے لئے کس کے دل میں سچی تڑپ ہے۔ لہٰذا، اس نظام کی طرف دعوت دینے والا بھلا) کیوں تیوری چڑھائے اور منہ موڑے اس بات پر کہ اس کے پاس ایک غریب اور معذور اندھا، ہدایت حاصل کرنے کیلئے آگیا ہے؟

(۶/۵۲ ؛ ۸/۶۳-۶۴ ؛ ۱۱/۲۷ ؛ ۱۸/۲۸ ؛ ۲۶/۱۱۱-۱۱۴)

(۳) تجھے کیا خبر کہ یہی اندھا، تمہاری تعلیم سے، کس قدر پاکیزہ اخلاق کا حامل بن جائے اور اس طرح اس کی ذات کی اعلیٰ نشو و نما ہو جائے۔

(۴) یا وہ اس تعلیم کو سمجھ لے تو اس سے بتدریج فائدہ حاصل کرتا چلا جائے۔

(۵ - ۶) اس کے برعکس، ایسا شخص جو اپنے آپ کو رشد و ہدایت سے مستغنی سمجھتا ہے — جو کہتا ہے کہ اُسے اس قسم کی تعلیم کی ضرورت ہے نہ پرواہ۔ تو تجھے کیا پڑی ہے کہ ایسے شخص کے لئے اپنی جان کھپاتا پھرے۔

(۷) اگر ایسے شخص کی اصلاح نہ ہو سکے تو تجھ پر اس سے کچھ الزام نہیں آسکتا۔

(۸ - ۱۰) الزام اس سے آتا ہے کہ ایک شخص، قرآن سمجھنے کے لئے، دوڑتا ہوا تیرے پاس آئے اور اُسے غلط روش زندگی کے تباہ کن نتائج کا خوف بھی ہو.... وہ ان سے بچنا چاہتا ہے۔ اور تو اس سے بے رُخی برتے۔ (۲/۴)

(۱۱) ۔ (قرآن کے متعلق اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ) یہ ایک واضح صحیفہ اور کھلی ہوئی کتاب ہدایت ہے۔ جس پر عمل کرنے سے انسان کو شرف و مجد حاصل ہو سکتا ہے۔

(۱۲) لیکن اس سے فائدہ وہی اٹھا سکتا ہے جو اپنے دل کی مرضی سے اسکی طرف آئے۔

(۱۳) یہی وجہ ہے کہ ہم نے اسے چھپا کر نہیں رکھا، بلکہ نہایت باعزت اوراق میں لکھوا کر دے دیا ہے (کہ جس کا جی چاہے پڑھ لے اور اس سے فائدہ حاصل کر لے)

(۱۴) اس میں بلندیٔ فکر اور پاکیزگیٔ اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔

(۱۵-۱۶) اس کے لکھنے والے' اور آگے پھیلانے والے' بھی نہایت اعلیٰ اخلاق کے حامل اور صداقت وشرافت کے بلند ترین معیار پر پورے اُترنے والے ہیں ــ کریم النفس اور کشادہ ظرف۔

(۱۷) اب سوچئے کہ جو شخص اس قسم کی بلند اور پاکیزہ تعلیم کو ماننے سے انکار کرے ــ اور انکار کرے اس لئے کہ اس کے پاس بڑی دولت اور قوت ہے اس لئے اُسے کسی کی پرواہ نہیں ہوسکتی ــ اس سے زیادہ تباہ و برباد ہونے والا اور کون ہوسکتا ہے؟

(۱۸)۔ (اسے اور کچھ نہیں تو کم ازکم اپنی زندگی پر ہی غور کرنا چاہیئے کہ وہ کن کن مراحل میں سے گزرتا ہے اور ہم اس کے لئے کس کس قسم کا سامانِ زیست مہیا کرتے ہیں) ــ وہ دیکھے کہ اس کی تخلیق کا آغاز کس چیز سے ہوا۔

(۱۹) ایک قطرۂ آب (مادۂ تولید) سے ۔ اس انداز کے آغاز کے بعد' ہم نے خاص انداز سے' اور پیمانے کے مطابق اس کی تشکیل کی۔

(۲۰)۔ (پھر اسے ذرائع علم ــ بصارت وسماعت وغیرہ' عطا کئے۔ نیز اس کے لئے سامانِ زیست مہیا کیا تاکہ) اُس پر زندگی کی راہیں آسان ہوجائیں۔

(۲۱) لیکن ان میں سے اکثر کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ بصارت وسماعت وغیرہ سے کام ہی نہیں لیتے اور مُردوں کی طرح قبرستانوں میں پڑے رہتے ہیں۔

(۲۲) لیکن بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو قانونِ خداوندی کی راہ اختیار کرکے' زندگی کی توانائیاں حاصل کرلیتے ہیں اور ان قبرستانوں سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ (اسی طرح' ان کی طبیعی موت اور موت کے بعد حیاتِ آخرت ہے)

(۲۳)۔ (اول الذکر گروہ ــ یعنی مُردوں کی سی زندگی بسر کرنے والوں) کی حالت یہ ہے کہ انہیں جس مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے' وہ اسے کبھی پورا نہیں کرتے۔ (وہ اپنی انفرادی مفاد پرستیوں کے پیچھے لگے رہتے ہیں۔ اور عالمگیر انسانیت کی ربوبیت کے متعلق کبھی سوچتے تک نہیں)

(۲۴) حالانکہ وہ اگر (کم ازکم) اپنی خوراک پر ہی غور کریں (تو اس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ یہ سامان زیست تمام انسانوں کے لئے خدا کی طرف سے بے مزد و معاوضہ ملتا ہے۔ اس لئے اس میں حسب ضرورت سب کا حصہ ہے)

(۲۵) بارش' جس پر پیداوار کا بنیادی انحصار ہے' انسان کی اپنی ہنرمندی سے نہیں برستی' ہمارے قانون کے مطابق برستی ہے۔ ($\frac{۵۶}{۶۳}$ ; $\frac{۶۷}{۳۰}$)

(۲۶)۔ (انسان، زمین میں بیج ضرور ڈالتا ہے۔ لیکن) زمین کو پھاڑ کر اس میں سے کونپل ہمارے ہی قانون کے مطابق پھوٹتی ہے۔ (یہ انسان کے بس کی بات نہیں کہ دانے کو کونپل میں تبدیل کر دے)

(۲۷-۳۱) پھر یہ بھی ہمارے قانون کے مطابق ہوتا ہے کہ اناج والی فصل سے اناج پیدا ہو اور دوسری فصلوں سے دوسری چیزیں۔ (مثلاً) انگور اور ترکاریاں۔ زیتون اور کھجوریں۔ گھنے باغات۔ اور دیگر قسم قسم کے پھل اور مویشیوں کے لئے چارہ۔

(۳۲) یہ سب تمہارے اور تمہارے مویشیوں کے لئے سامانِ زیست کا کام دیتا ہے۔ (اسے اسی مصرف کے لئے رہنا چاہیئے)

(۳۳)۔ (لیکن جو لوگ خدا کی اس موہبت کو ذاتی ملکیت بنا کر، نوعِ انسان کو اس کی پرورش سے محروم کر دیں، اور سمجھانے سے سمجھیں ہی نہیں، تو ان کے ساتھ تصادم اور ٹکراؤ ناگزیر ہو جاتا ہے چنانچہ) جب وہ تصادم کا وقت آئے گا تو اسلحہ کی جھنکار سے کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دے گی۔

(۳۴) اس وقت ان کی نفسا نفسی کا یہ عالم ہوگا کہ بھائی، بھائی کو چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔

(۳۵-۳۶)۔ اولاد ماں باپ کو چھوڑ جائے گی۔ میاں اپنی بیوی تک کو بھول جائے گا اور ماں باپ اولاد کو چھوڑ جائینگے۔

(۳۷) غرضیکہ اس وقت، ہر شخص اپنی اپنی فکر میں اس قدر غلطاں و پیچاں ہوگا کہ اُسے کسی دوسرے کی طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں ہوگی۔

(۳۸-۳۹) جب اس تصادم کا فیصلہ ہوگا تو ایک گروہ (جس نے قوانینِ خداوندی کے مطابق روش اختیار کی تھی) کامیابی و کامرانی کی وجہ سے نہایت خوش و خرم ہوگا۔ ان کے چہرے شگفتگی و شادابی سے چمک رہے ہونگے۔

(۴۰-۴۱) اور دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہوگا جن کے چہروں پر ذلت کا گرد و غبار اور رسوائیوں کی سیاہیاں چھا رہی ہونگی۔ (۸۰/۲۶)

(۴۲) یہ ہوگا اُن لوگوں کا انجام جو اس وقت خدا کے دیئے ہوئے سامانِ رزق پر اپنی مفاد پرستیوں کے) پردے ڈالتے ہیں، اور یوں خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا انکار کرتے ہیں۔ اس سے انسان، طبقات میں بٹ جاتے ہیں اور نوعِ انسانی میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے جو عدالتِ خداوندی میں بہت بڑا جرم ہے (ہم چاہتے یہ ہیں کہ تمام انسان ایک عالمگیر برادری کی حیثیت سے رہیں۔ ان میں پھوٹ نہ پڑے)۔

# سُورۃ التکویر (۸۱)

(۱)۔ (جب انسانوں کے خودساختہ نظامِ تمدن ومعاشرت کی جگہ قرآنی نظام لے لیگا تو اُس وقت کی انقلابی کیفیات کے متعلق یوں سمجھو کہ) ملوکیت کا نظام (جس کی سب سے بڑی نمائندہ نزول قرآن کے وقت ایران کی مملکت تھی، اور اس کے جھنڈے کا نشان "شمس" تھا) لپیٹ کر رکھ دیا جائے گا۔[1]

(۲) اور ان کے اہالی موالی (چھوٹی چھوٹی ریاستیں) سب جھڑ کر نیچے گر جائینگے۔ ان کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ ان کی قوت ماند پڑ جائے گی۔

(۳) اور پہاڑوں جیسے محکم امراء اور رؤسا اپنی اپنی جگہ سے ہل جائینگے۔ (۲۰/۱۰۵ ; ۵۶/۵ ; ۷۸/۲۰)

(۴) اور جن ذرائع رسل ورسائل (مثلاً اونٹوں) کو اِس وقت اتنی اہمیت دی جارہی ہے وہ سب بیکار ہو جائینگے۔

(۵) اور وحشی اور نامانوس قومیں بھی اجتماعی زندگی کیطرف آتی جائینگی۔

(۶) اور سمندروں میں آمد ورفت کا سلسلہ اتنا وسیع ہو جائے گا کہ ہر وقت بھرے بھرے دکھائی دینگے۔ اور ان کے کناروں کی بستیاں بھی بڑی آباد ہو جائیں گی۔

(۷) اور اطراف واکناف عالم کی آبادیاں ایک دوسرے کے ساتھ ملتی جائینگی

(۸۔۹) جب اُن لڑکیوں کے متعلق جنہیں معاشرہ زندہ درگور کر دیتا ہے اور ان بیچاریوں کا پرسانِ حال کوئی نہیں ہوتا، پوچھا جائے گا کہ انہیں بالآخر کس جرم کی پاداش میں ذبح کیا جاتا رہا ہے؟ (یعنی جب عورتوں کو ان کے حقوق دلائے جائینگے۔)

(۱۰) اور اخبارات ورسائل جگہ جگہ پھیل جائینگے۔

(۱۱) اور اجرامِ فلکی پر پڑے ہوئے پردے، ایک ایک کرکے اٹھتے چلے جائینگے (اُن کے حالات دریافت کئے جائینگے)

(۱۲) تو اس وقت خدا کے قانونِ مکافات کا عمل بھی تیز تر ہو جائے گا۔ کیونکہ اس وقت وہ نظام متشکل ہو جائے گا جس میں ہر معاملہ انصاف اور قانون کے مطابق طے پائے گا۔ لہٰذا، اس کی رُو سے

---

[1] ان آیات کے سلسلہ میں تمہیدی نوٹ دیکھئے

مجرمین کے لئے جہنم کے شعلے زیادہ تیزی سے بھڑک اٹھیں گے۔

(۱۳) اور اُس نظام کی پابندی کرنے والوں کے لئے جنتی معاشرہ قریب تر لایا جائے گا۔

(۱۴) یعنی اُس وقت ہر شخص اپنے اپنے اعمال کے نتائج اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لے گا۔

(۱۵) (ہم یہ باتیں یونہی نہیں کر رہے۔ اِس حقیقت پر سارا نظامِ کائنات شاہد ہے) اس پر شاہد ہیں وہ ستارے جو طلوع ہونے کے بعد دبے پاؤں، آہستہ آہستہ، پیچھے ہٹتے رہتے ہیں۔

(۱۶) اور تیز خرام ستارے، جو اپنی اپنی منزل طے کر کے، چھپ جاتے ہیں۔ (۵۳/۱ ; ۵۶/۷۵)

(۱۷) اور رات، جو خاموشی سے آتی اور خاموشی سے چلی جاتی ہے۔

(۱۸) اور صبح، جب وہ نئی زندگی کا پیغام لے کر نمودار ہوتی ہے۔

(۱۹) یہ سب مظاہرِ فطرت اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ جو شخص یہ باتیں تم سے کہہ رہا ہے وہ ہمارا بھیجا ہوا پیغامبر ہے اور نہایت معزز پیغامبر۔

(۲۰) اسے اُس خدا کی طرف سے وحی کی تائید و قوت حاصل ہے جو کائنات کے مرکزی کنٹرول کو اپنے ہاتھ میں لئے ہوتے ہے۔

(۲۱) وہ رسول بڑا قابلِ اعتماد ہے وہ اس پیغام کے پہنچانے میں کسی قسم کی خیانت نہیں کرتا۔ پھر وہ صرف پیغام کو پہنچاتا ہی نہیں، اس کی عملی تشکیل بھی کرتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ جو لوگ اس نظام کی صداقت پر یقین رکھیں، وہ اس کی بات مانیں۔ اور اس کے فیصلوں کی اطاعت کریں۔ (اس کے بغیر کوئی نظام قائم ہی نہیں رہ سکتا)۔

(۲۲) یاد رکھو! تمہارا یہ رفیق کوئی پاگل پن کی باتیں نہیں کرتا۔ جو کچھ یہ کہہ رہا ہے وہ ہو کر رہے گا۔

(۲۳) اس لئے کہ اس نے اپنے آپ کو علم کے اُس بلند ترین اور وسیع ترین مقام پر فائز پایا ہے جہاں انسان کو خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے۔ (اس طرح یہ رسول جو کچھ کہتا ہے، گویا آنکھوں دیکھا حال کہتا ہے۔ (۵۳/۱-۷)

(۲۴) اور پھر جو کچھ اسے وحی کے ذریعے ملتا ہے، اسے اپنی ذات تک محدود نہیں رکھتا۔ وہ اسے، نہایت کشادہ ظرفی سے دوسروں تک بھی پہنچاتا ہے۔ سب کو اس میں شریک کرتا ہے۔

(۲۵) یہ کسی کے سرکش جذبات کی باتیں نہیں جو محض قیاسات پر مبنی اور حقیقت سے بہت دور ہوتی ہیں۔

(۲۶) جب حقیقت یہ ہے تو پھر بتاؤ کہ تم اس ضابطۂ قوانین کو چھوڑ کر کدھر چلے جا رہے ہو؟

(۲۷) لیکن اگر تم اس سے بے رُخی برتتے رہو گے تو اس سے اس کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ اس لئے کہ یہ کسی خاص قوم یا خاص ملک کے لئے ضابطہ حیات نہیں۔ یہ تمام اقوامِ عالم کے لئے قوانین کا ضابطہ ہے۔

(۲۸) اس لئے نوعِ انسان میں سے جو قوم بھی چاہے اس کے ذریعے، زندگی کی متوازن اور سیدھی راہ پر چل سکتی ہے۔ (۱/۵)

(۲۹) لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ تم اپنے ذاتی رجحانات اور انفرادی مفادات کو ایک طرف رکھ کر، وہی کچھ چاہو جو اُس خدا کے قانون کا تقاضا ہے جس نے تمام اقوامِ عالم کی نشوونما کا ذمہ لے رکھا ہے (لہٰذا، اس سے وہی قوم مستفید ہو سکتی ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے عالمگیر نظامِ ربوبیت قائم کرنے کا تہیہ کرے اور اس طرح اپنی منشاء کو خدا کی مشیت کے ساتھ ہم آہنگ کر دے۔ (۲۷/۵۹ ; ۲۷/۳۰)

---

# سورۃ انفطار۔ (۸۲)

(۱)۔ (جس انقلاب کا ذکر پیچھے سے چلا آرہا ہے اس میں کیفیت یہ ہوگی کہ) فضا میں پھیلی ہوئی توانائیاں پھٹ جائیں گی۔

(۲) اور ستارے منتشر ہو جائیں گے (یا چھوٹی چھوٹی جماعتیں بکھر جائیں گی۔ اور صرف بڑی بڑی طاقتیں باقی رہ جائینگی)

(۳) اور سمندر (یا دریا) بہ نکلیں گے۔ یعنی ان میں آمد و رفت تیز تر ہو جائے گی۔

(۴) اور زمین کے دفائن کو کھود کھود کر باہر نکالا جائے گا۔ (۱۰/۹)

(۵) اُس وقت (انسان کی تمدنی دنیا میں بھی ایسا نظام متشکل ہو جائے گا جس میں) ہر شخص اپنے اگلے پچھلے اعمال کے نتائج اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لے گا۔

(۶) اے انسان! (تو جو خدا کے قانون سے اس طرح سرکشی اختیار کر رہا ہے تو) وہ کونسی چیز ہے جو تجھے خدا کی بھرپور ربوبیت کے متعلق دھوکے میں رکھ رہی ہے، اور اس کی خلاف ورزی کی جرأت دلا رہی ہے؟

(۷) وہ خدا جس نے (اپنے قانونِ تخلیق کے مطابق) تمہیں مختلف تخلیقی مراحل سے گذارا۔ تمام حشو و زوائد کو الگ کیا۔ اور تمہاری اخلاط و عناصر میں نہایت عمدہ توازن اور اعتدال پیدا کر دیا۔ (۹۵/۴)

(۸) اور اس کے بعد اپنے قانونِ مشیت کے مطابق، تمہیں مناسب پیکر عطا کر دیا۔

(۹) سوچو کہ تم اس خدا کے قانونِ مکافات کو جھٹلاتے ہو؟ (لیکن تمہارے جھٹلانے سے کیا ہوتا ہے؟)
(۱۰-۱۲) اس نے تم پر محافظ مقرر کر رکھے ہیں ـــ نہایت معزز اور امین ـــ جو کچھ تم کرتے ہو انہیں اس سب کا علم ہوتا ہے۔ وہ اسے ریکارڈ کرتے رہتے ہیں۔
(۱۳) ہمارے اس قانون کے مطابق، جو لوگ انسانی زندگی میں وسعت اور کشادگی پیدا کرتے ہیں، آسائشوں میں رہیں گے۔
(۱۴) اور جو عالمِ انسانیت اور خود اپنی ذات میں انتشار پیدا کرتے ہیں انکی نشو و نما رک چکی ہوگی (۲/۴۴)
(۱۵) اور وہ ظہور نتائج کے دن اپنے آپ کو جہنم میں پڑا دیکھیں گے۔
(۱۶) یاد رکھو! وہ اب بھی جہنم کی نگاہوں سے اوجھل نہیں۔ (۲۹/۵۴ ; ۴۹/۳۶)
(۱۷) (جہنم انہیں اس وقت بھی دیکھ رہا ہے۔ اُس وقت وہ بھی جہنم کو دیکھ لیں گے۔ یہ کچھ ہوگا یوم الدین میں۔ یعنی ظہور نتائج کے دور میں) تجھے خدا کے سوا کون بتا سکتا ہے کہ یوم الدین (ظہور نتائج کا دور) کیسا ہوگا؟
(۱۸) یقیناً خدا کے سوا کوئی نہیں بتا سکتا کہ اُس دور کی کیفیت کیا ہوگی۔
(۱۹) یہ وہ دور ہوگا جس میں ہر انسان اپنے اپنے اعمال کو اپنے سامنے دیکھے گا۔ کوئی کسی دوسرے کے لئے کچھ نہیں کر سکے گا۔ نہ ہی کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر کسی قسم کا اختیار و اقتدار ہوگا۔ اختیارات تمام کے تمام قوانینِ خداوندی کے لئے مختص ہوں گے۔ حکومت صرف اُن قوانین کی ہوگی، کسی اور کی نہیں ہوگی۔ یہ ہوگا یوم الدین! (۱/۱۲)